ذرا ٹھہر جا اسی موڑ پہ
نگہت سیما

ذرا ٹھہر جا اسی موڑ پہ

نگہت سیما

ذرا ٹھہر جا اسی موڑ پہ

بھاگتے بھاگتے اس کی سانس پھول گئی تھی لیکن وہ بھاگ رہی تھی۔ بھاگتے ہوئے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اُبھرے ہوئے پتھر سے ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ پائوں میں پہنا ہوا بیڈ روم سلیپر دور جا گرا تھا۔ اس نے بے اختیار پائوں کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا، دُور تک کوئی نہیں تھا۔ لمبی لمبی سانس لیتے ہوئے اس نے ہاتھ ہٹا کر پائوں کا انگوٹھا دیکھا۔ ایک طرف سے ناخن اُتر گیا تھا اور خون رِس رہا تھا۔ لیکن درد بے تحاشا تھا۔ دائیں ہاتھ سے پائوں کو دباتے ہوئے وہ چاروں طرف سر گھما گھما کر دیکھ رہی تھی۔ جب کوئی نظر نہ آیا تو اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے اس نے کچھ فاصلے پر پڑے اپنے جوتے کو دیکھا۔ یہ بیڈ روم سلیپر اُس نے ناران سے خریدے تھے۔ میرون مخمل کے اپر والے یہ سلیپر بہت گرم تھے اور اسے بہت پسند تھے۔ یک دم کسی یاد نے اُس کے دل میں چٹکی لی۔ ساتھ ہی پائوں میں درد کی شدید لہر اُٹھی تھی۔ وہ کھڑے ہوتے ہوئے پھر بیٹھ گئی اور ایک لمحے کے لئے ارد گرد سے بے خبر ہو گئی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے وہ ناران پہنچ گئی تھی۔

افروز کے بازو کا سہارا لئے چڑھائی سے اترتے ہوئے اس کی نظر اس چھوٹی سی دکان پر پڑی تھی، جس پر بیٹھا ہوا بوڑھا ہمیشہ ہی اُنہیں پُر اُمید نظروں سے دیکھتا تھا۔ تب بے اختیار ہی وہ اس کی دکان کی طرف بڑھ گئی تھی اور بلا ضرورت ہی یہ بیڈ روم سلیپر لے لئے تھے۔

اُس نے پھر اٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن اسے لگا، جیسے وہ چل نہیں سکے گی۔ پاؤں میں شدید درد تھا۔ نچلا ہونٹ دانتوں تلے مضبوطی سے دبائے اس نے بائیں پاؤں پر زور دیتے ہوئے قدم بڑھایا ہی تھا کہ دائیں طرف ایک چھوٹے سے ٹیلے کے پیچھے سے وہ اچانک نمودار ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ تکلیف کی پرواکئے بغیر بھاگ کھڑی ہوتی، وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے قریب آکھڑا ہوا تھا۔ وہ یک دم بیٹھ گئی تھی۔ پاؤں میں درد کی لہریں اُٹھ رہی تھیں اور وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ دیئے تفکر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے سر پر گرم اُونی سفید ٹوپی تھی اور وہ نہایت قیمتی لیدر کی جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے سر اُٹھا کر اسے دیکھا۔

''میں اُدھر ریسٹ ہاؤس کے ٹیرس پر کھڑا تھا۔ میں نے دور سے آپ کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ کیا ہوا تھا؟ آپ اس بری طرح کیوں بھاگ رہی تھیں؟ میں فوراً نیچے اُترا لیکن پیچ در پیچ راستوں کی وجہ سے آپ یک دم نظروں سے اوجھل ہو گئیں اور اب اس ٹیلے پر سے میں نے آپ کو یہاں بیٹھے دیکھا۔''

اُس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ دل سینے کے اندر اب بھی معمول سے زیادہ زور سے دھڑک رہا تھا۔ دسمبر کی اس یخ صبح میں بھی اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے اور تکلیف کی شدت سے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

''اوہ میرے خدا۔۔۔ آپ کا پاؤں، کیا ٹھوکر لگی ہے؟'' اُس کی نظر اچانک ہی اس کے پاؤں پر پڑی تو وہ یک دم بیٹھ گیا اور اس کے پاؤں کو بغور دیکھا۔

''غالباً موچ آگئی ہے۔'' اتنی دیر میں پاؤں کچھ سوج چکا تھا۔

''تھوڑا سا ناخن بھی اُتر گیا ہے۔ یہ اب پورا اُتر جائے گا۔ لیکن آپ پلیز اسے چھیڑیئے گا مت۔ خود ہی اُترے گا، جب نیچے نیا ناخن نکلے گا۔'' اس کے لہجے میں نرمی اور آنکھوں میں تشویش تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کے پاؤں کو ذرا سا دبا کر چھوڑ دیا اور پھر کھڑا ہو گیا۔

''میرے خیال میں آپ کے لئے ان پتھریلے راستوں پر چلنا مشکل ہو گا۔ آپ یہیں بیٹھیں، میں روڈ کی طرف سے جیپ لے کر آتا ہوں۔ میں تو آپ کو بھاگتا ہوا دیکھ کر اپنے ریسٹ ہاؤس کی بیک سے آیا ہوں۔''

اُس نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا اور پھر چاروں طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر لکھا خوف صاف پڑھا جا رہا تھا۔

''اوہ۔۔۔ کیا آپ کسی سے ڈر کر بھاگی تھیں؟ کوئی آپ کا پیچھا کر رہا تھا؟''

"ہاں۔ مجھے ایسا ہی لگا تھا۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"آپ یہاں اکیلے بیٹھتے ہوئے ڈریں گی تو پلیز، آپ میرا سہارا لے لیں، کسی طرح ڈاک بنگلے تک چلتے ہیں۔ پھر وہاں سے جیپ لے کر پہلے میں آپ کو ڈسپنسری لے چلتا ہوں۔ ویسے تو موچ ہی ہے، پھر بھی احتیاطاً دکھا لیتے ہیں اور گل لالہ کو دکھانے کے بعد آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دیتا ہوں۔"

اس وقت اُس کا دل شدید خوف کی زد میں تھا اور وہ کچھ بھی نہیں بول پا رہی تھی۔ اُس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو جھجکتے ہوئے اس کے بازو کا سہارا لیتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

تبھی اُس کی نظر سامنے پتھروں پر پڑی چپل پر پڑی اور پھر اُس کے ننگے پاؤں پر۔

"آپ یہ۔۔۔۔ یہ بیڈروم سلیپر پہن کر ان پتھروں پر دوڑ رہی تھیں؟ باہر آنے سے پہلے جو گرز یا کوئی بند جوتے پہنا کریں۔" اسے نصیحت کرتے ہوئے وہ اس کے سلیپر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ پاؤں میں یہ مشکل اسے پہنتے ہوئے تمکین نے وضاحت کی۔

"میں یونہی ٹیرس پر کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ سامنے کا سارا منظر دُھند میں لپٹا ہوا اور اس قدر خوب صورت لگ رہا تھا۔ اور پھر پہاڑوں کے پیچھے سے نمودار ہوتا سورج۔ میں بے خود سی ہو کر باہر نکل آئی۔ جو گر پہننے کا مجھے خیال ہی نہیں آیا۔"

"ہاں، یہ منظر اور ان کا حُسن ایسے ہی پاگل کر دیتا ہے۔" وہ اسے سہارا دیتے ہوئے بڑبڑایا۔ "میں جب یہ اور اس کے آس پاس کے مناظر دیکھتا ہوں تو افسوس ہوتا ہے مجھے کہ میں پہلے کیوں ادھر نہیں آیا۔"

"آپ اتنے ٹھنڈے موسم میں یہاں صرف اس علاقے کا حُسن دیکھنے آئے ہیں؟"

وہ مدھم سا مسکرایا۔

"میں جب یہاں آیا تھا تو مجھے علم نہیں تھا کہ یہاں اتنا حُسن ہو گا۔"

یہ شخص پہلے چار دن سے ڈاک بنگلے میں نظر آرہا تھا۔ تمکین نے کئی بار اپنے ٹیرس پر سے اُسے ڈاک بنگلے کے ٹیرس پر دُور بین لگائے کھڑے دیکھا تھا اور کئی بار اُسے لگا تھا، جیسے وہ اُس کی طرف دیکھ رہا ہو۔ دلبر نے اُسے بتایا تھا کہ وہ کوئی ٹورسٹ ہے۔

"لیکن اتنے ٹھنڈے اور خراب موسم میں بھلا کون آتا ہے ادھر؟" اسے حیرت ہوئی تھی۔

"ہوتے ہیں کچھ سر پھرے۔۔۔۔ ادھر تین سال پہلے ایک شخص آیا تھا بڑے صاحب کا دوست تھا۔ سردیوں کے تین چار مہینے یہاں رہا۔ اسی ڈاک بنگلے میں۔ کہانیاں لکھتا تھا وہ۔ میرا ماما ڈاک بنگلے میں چوکیدار ہے۔ اس نے بتایا تھا مجھے۔"

'تو کیا یہ بھی کوئی لکھاری ہے؟' اُس نے سوچا تھا۔ لیکن دلبر سے کچھ نہیں کہا تھا۔

وہ اس شخص کو نہیں جانتی تھی، پھر بھی اس پر اعتماد کر کے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ کیونکہ وہ یک دم بے حد خوفزدہ ہو گئی تھی۔ وہ ان پہاڑوں کو قریب سے دیکھنے کی دھن میں آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی اور پہاڑ تھے کہ دُور ہوتے جا رہے تھے۔ سورج بہت آہستہ آہستہ پہاڑوں کے پیچھے سے جھانکتا تھا۔ یکایک وہ رُک گئی

تھی۔ اُسے لگا تھا، جیسے کوئی دبے قدموں اس کے پیچھے چل رہا ہو۔ لیکن جب مڑ کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا۔ کچھ دُور جا کر پھر اسے یہی احساس ہوا تھا۔ اب کے وہ تیزی سے مڑی تھی اور اُس نے لوئی (اُونی کمبل) میں لپٹے ہوئے کسی شخص کو دیکھا تھا، جو اسے مڑتے دیکھ کر تیزی کے ساتھ دائیں طرف چھوٹے سے ٹیلے کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔

'کیا یہ شخص مجھے نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔۔۔؟' تمکین نے بے اختیار سوچا۔ 'اور اگر نہیں تو پھر اسے چھپنے کی کیا ضرورت ہے؟' یک دم ہی دل انجانے خوف سے لرزنے لگا تو وہ تیز تیز قدموں سے واپس مڑی۔ وہ شخص ٹیلے کے پیچھے سے نکل آیا تھا اور اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کا آدھا چہرہ لوئی میں چھپا ہوا تھا۔ صرف پیشانی اور آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ یک دم ہی بھاگنے لگی تھی۔ کئی بار اس نے مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ اس کے پیچھے ہی آ رہا تھا۔ پھر یکایک وہ موڑ پر غائب ہو گیا۔ لیکن وہ بھاگتی ہی رہی۔ وہ بے حد خوف زدہ ہو گئی تھی۔

"ہو سکتا ہے، وہ کوئی بے ضرر شخص ہو اور آپ کو وہم ہوا ہو۔" ساری بات سننے کے بعد اجنبی شخص نے کہا تو اسے بھی گمان گزرا کہ شاید یہ اس کا وہم ہی ہو گا۔ ڈاک بنگلے سے جیپ میں بیٹھ کر وہ ڈسپنسری میں آئے تھے۔ ڈسپنسر گل لالہ نے اس کے پاؤں پر گرم پٹی باندھ دی تھی۔

"موچ ہی ہے، سر!" اُس نے پین کلر ٹیبلٹ دیتے ہوئے تسلی دی تھی۔ "پریشانی کی بات نہیں ہے۔ ہڈی وغیرہ محفوظ ہے۔"

اور پھر ڈسپنسری سے گھر تک اُن کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

"میں آپ کو اندر تک چھوڑ آتا ہوں۔" اس نے اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر کہا۔

"نہیں، میں چلی جاؤں گی۔ اور آپ کا شکریہ بہت۔ میری وجہ سے آپ کو زحمت ہوئی۔"

"نہیں، مجھے کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ اور پلیز اپنا خیال رکھئے گا، دو تین دن ریسٹ کریں اور آج اوپر مت جائیے گا سیڑھیاں چڑھ کر۔"

وہ سر ہلاتی ہوئی دروازہ کھول کر اندر کی طرف بڑھی ہی تھی کہ اس نے بے اختیار آواز دی۔

"تمکین!"

اُس نے مڑ کر بے حد حیرت سے دیکھا۔

"آپ کو میرا نام کیسے پتہ چلا؟" ایک بے اختیار مسکراہٹ نے اُس کے لبوں کو چھوا۔

"آئندہ اکیلے باہر مت نکلئے گا۔ ہو سکتا ہے، آپ کا وہم نہ ہو اور کوئی آپ کو نقصان پہنچا دے۔" وہ اپنی بات کہہ کر رکا نہیں تھا۔ کچھ دیر وہیں دیوار کے سہارے کھڑی سوچتی رہی کہ اس ڈاک بنگلے والے اجنبی کو بھلا اس کا نام کیسے معلوم ہوا۔

"شاید کبھی آپا کو بلاتے ہوئے سنا ہو یا پھر دلبر نے بتایا ہو۔ وہ کل بھی تو اپنے ماموں سے ملنے ڈاک بنگلے گیا تھا۔'
اُس نے خود ہی اندازہ لگایا اور ہولے ہولے قدم اٹھاتی اندر لائونج تک آئی۔ سامنے ہی صوفے پر شہر بانو بیٹھی
تھیں اور ان کی نظریں اسی پر لگی تھیں۔ کھوجتی، اندر تک اُترتی نظریں۔

"یہ صبح صبح کہاں چلی گئی تھیں؟"

"یونہی اندر دل گھبرا رہا تھا۔ باہر نکلی تو ٹھوکر لگنے سے پائوں میں موچ آگئی۔" اس نے سہارے کے لئے
دروازے پر ہاتھ رکھا۔

"ہوں۔۔۔" انہوں نے معنی خیز انداز میں کہا اور دائیں طرف کھلی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ذرا
کھڑکی بند کر دینا۔ تمہیں دیکھنے کے لئے کھولی تھی، لیکن کمرا ٹھنڈا یخ ہو گیا ہے۔ حالانکہ آج تو سورج بھی نکل
آیا ہے۔ بھئی تمہارا ہی جگرا ہے، اس ٹھنڈ میں سیر کرنے نکل کھڑی ہوئی ہو۔ ویسے یہ آئی کس کے ساتھ ہو؟"
انداز جتاتا ہوا سا تھا۔

ہولے ہولے دیوار کے سہارے بہ مشکل چلتی ہوئی وہ کھڑکی تک آئی اور اس نے کھڑکی کے پٹ بند کرتے
ہوئے پردے آگے کئے۔

"معلوم نہیں آپا! موچ کی وجہ سے چلا نہیں جا رہا تھا تو یہ جیپ پر چھوڑ گیا۔"

"ارے، اتنی انجان مت بنو۔ دلبر بتا رہا تھا کہ یہ سامنے ڈاک بنگلے میں رہ رہا ہے۔ کئی دنوں سے ادھر آیا ہوا
ہے۔ دانیال مرزا نام ہے اس کا اور وہ یہاں کوئی تحقیق کر رہا ہے۔"

"آپا! میں نے نام نہیں پوچھا اور نہ ہی یہ پوچھا کہ وہ کیوں آیا ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا اور اس طرح
ہولے ہولے چلتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اُس کا بیڈ روم اوپر تھا اور اس کے کمرے کے سامنے موجود
گیلری ڈاک بنگلے کی طرف تھی اور ڈاک بنگلے کے کمروں کے آگے بنے چھوٹے چھوٹے ٹیرس یا گیلریاں اس
طرف تھیں، مین گیٹ دوسری طرف تھا۔ اس کا ارادہ تو تھا کہ وہ یہیں، لائونج میں صوفے پر لیٹ جائے گی
لیکن آپا کی گفتگو سے بیزار ہو کر وہ اوپر اپنے بیڈ روم میں آگئی اور نڈھال سی ہو کر بیڈ پر گر گئی۔ لائونج سے شہر بانو
کی آواز آرہی تھی۔ وہ اونچی آواز میں دلبر کو پکار رہی تھیں۔

"ارے کمبخت! کیا اب تک تیری چائے نہیں گلی؟ کیا سیلون چلا گیا ہے، چائے کی پتی اُگانے؟۔۔۔ ارے
صبح منہ اندھیرے سے اُٹھی بیٹھی ہوں اور منہ بھی سوکھ گیا ہے۔"

تمکین جانتی تھی کہ یہ سب کچھ اسے ہی سنایا جا رہا ہے۔ لیکن اس وقت درد اتنا شدید تھا کہ اُس میں کچن میں
کھڑے ہونے کی ہمت نہ تھی۔ اُس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس اُٹھایا اور پرس سے گولی نکال کر کھائی۔
اگرچہ گل لالہ نے تاکید کی تھی کہ وہ خالی پیٹ ٹیبلٹ نہ لے بلکہ ناشتے کے بعد لے۔ لیکن ناشتہ۔۔۔ وہ
جانتی تھی کہ اب شہر بانو دلبر اور اس کی ماں کو اتنا مصروف کر لیں گی کہ گھنٹہ بھر سے پہلے فارغ نہیں کریں
گی۔ اور ممکن ہے پھر بھی کسی نہ کسی کام میں اُلجھائے رکھے اور درد بہت شدید تھا پتہ نہیں، بی بی کب فارغ ہو
کر اوپر آئے گی اور اس کے لئے چائے بنائے گی۔

اُس نے سر تکیے پر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور بیتے دن، ذہن کی اسکرین پر کسی فلم کے منظر کی طرح گزرنے لگے۔

VVV

"تمکین۔۔۔!" افروز نے تکیے سے سر اٹھا کر تمکین کی طرف دیکھا، جو اس کی طرف پیٹھ کئے، وارڈروب میں منہ دیئے، جانے کیا کر رہی تھی۔

"تمو!" وہ بیڈ پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے اُٹھا۔ "یہاں کیا کر رہی ہو؟ اِدھر آئو نا، یہاں میرے پاس آکر بیٹھو۔"

تمکین نے ہاتھوں کی پشت سے جلدی جلدی اپنے بھیگے رخساروں کو پونچھا لیکن آنسو تھے کہ بہتے چلے آرہے تھے۔

"تمکین! پلیز، اتنی دُور دُور تو مت رہو۔۔۔ جو تھوڑے سے دن ہیں زندگی کے، وہ تو۔۔۔"

تمکین نے تڑپ کر اُسے دیکھا۔ "مت کریں۔۔۔ مت کریں ایسی باتیں۔"

"تم رو رہی ہو تمکین؟۔۔۔ مت روئو، پلیز۔" وہ ہتھیلیاں بیڈ کی پٹی پر ٹکاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ تمکین نے رخ موڑ لیا تھا اور آنسو پہلے سے بھی زیادہ روانی سے بہنے لگے تھے۔

"تمو!" آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ اس کے پیچھے آکھڑا ہوا تھا اور اب اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستگی سے کہہ رہا تھا۔

"تمو!۔۔۔ تمکین! میری جان! پلیز ایسا مت کرو۔ تمہارے آنسو میری فصیلِ دل ڈھادیتے ہیں۔ تم نہیں جانتیں۔ تم کبھی بھی نہیں جان سکتیں کہ ان چند ماہ میں تم میرے خون میں دوڑنے لگی ہو۔ میری رگوں میں سما گئی ہو۔ میں کیسے۔۔۔ کیسے تمہیں چھوڑ کر جائوں گا، اتنی جلدی؟۔۔۔ ابھی تو میں نے تم سے وہ سب کہا بھی نہیں جو مجھے تم سے کہنا تھا۔ کاش!۔۔۔ اے کاش! تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنے سے پہلے مجھے معلوم ہو جاتا کہ میں چند ماہ کا مہمان ہوں تو میں کبھی تمہیں۔۔۔ اپنی زندگی میں شامل نہ کرتا۔ تمو! میں نے تمہارے ساتھ ظلم کیا ہے نا۔۔۔!"

"فار گاڈ سیک، افروز!۔۔۔ مت کریں ایسی باتیں۔۔۔ کیوں کرتے ہیں اس طرح کی باتیں؟۔۔۔ کچھ نہیں ہوگا آپ کو۔۔۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔"

تمکین نے تیزی سے مڑتے ہوئے کہا تھا۔ اُس کی لانبی گھنی پلکوں پر آنسو اب بھی اٹکے ہوئے تھے۔ رخسار بھیگے ہوئے تھے۔ خوب صورت کٹائو والے لب ہولے ہولے لرز رہے تھے۔

‘‘حقیقت کو قبول کیوں نہیں کر لیتی ہو تم؟’’ لمحہ بھر اُس کی طرف دیکھنے کے بعد افروز نے نگاہیں جھکا لی تھیں۔

‘‘ہر مرض کا علاج ہوتا ہے، افروز! کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی کے ہاتھ میں شفا ہو گی، آپ کے لئے بھی۔ ہم باہر چلے جائیں گے۔ وہاں کے ڈاکٹرز۔۔۔’’

‘‘کچھ نہیں۔ کچھ فائدہ نہیں ہے تمکین!’’ افروز کے چہرے پر مایوسی تھی۔ ‘‘بہت دیر ہو چکی ہے۔’’ وہ واپس مڑا۔

‘‘کوئی نہیں۔ کوئی دیر نہیں ہوئی افروز!’’ تمکین نے بے قراری سے کہتے ہوئے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔
‘‘آپ پلیز۔۔۔ آپ کیوں بات نہیں مان لیتے میری؟’’

‘‘کوئی فائدہ نہیں، تمو!’’ اُس کے لہجے میں تھکن تھی۔ اُداسی تھی۔

‘‘کیوں۔۔۔ کیوں فائدہ نہیں؟ کیا آپ کو دعاؤں پر بھی یقین نہیں رہا؟ کیا آپ اللہ سے بھی نااُمید ہو گئے ہیں؟’’ اُس نے اُس کا بازو جھنجوڑ ڈالا۔

‘‘تمکین! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں میری جان! اب دعاؤں کا بھی وقت نہیں رہا۔’’ اُس کے لہجے میں نرمی تھی اور وہ بہت دکھ اور افسوس سے تمکین کو دیکھ رہا تھا۔

‘‘نہیں۔۔۔ نہیں جانے دوں گی میں آپ کو۔۔۔ نہیں جا سکتے آپ مجھے یوں اس طرح چھوڑ کر۔ اگر یوں ہی ساتھ چھوڑ دینا تھا تو کیوں عمر بھر ساتھ نبھانے کے وعدے کئے تھے؟ کیوں کہا تھا کہ

ہم آخری سانسوں تک ایک دوسرے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلیں گے؟’’ وہ روتے ہوئے اس کے سینے پر مکے مارنے لگی۔

اُس نے دایاں بازو پھیلاتے ہوئے اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

‘‘تمکین!۔۔۔ تمو!۔۔۔ میں کب چاہتا ہوں ایسا؟۔۔۔ میں کب اپنی مرضی سے جا رہا ہوں؟ میں تو۔۔۔’’ وہ اُسے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لئے ہولے ہولے کہہ رہا تھا۔ ‘‘تمو!۔۔۔ میں تو تمہارے سنگ آخری سانس تک چلنا چاہتا تھا، لیکن زندگی ہی مہلت نہیں دے رہی مجھے کہ میں اپنا عہد وفا کر سکوں۔’’ اس نے اس کے سر پر اپنی ٹھوڑی ٹکائی تھی اور آنسو بہت خاموشی سے اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے اس کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

‘‘آپ۔۔۔ آپ رو رہے ہیں، افروز!’’ کچھ دیر بعد تمکین نے اس کے سینے سے سر ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

‘‘ہاں۔۔۔ نہیں تو۔’’ افروز نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

‘‘افروز۔۔۔!’’

"اوں۔۔۔ ہوں۔" دایاں بازو اُس کے گرد حمائل کئے، بائیں ہاتھ سے اُس کے رخساروں پر بہتے آنسوئوں کو پونچھتے ہوئے افروز نے نفی میں سر ہلایا۔

"آئو، وہاں بیڈ پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" وہ اسے بازو کے گھیرے میں لئے لئے بیڈ پر آیا۔

"یہاں۔۔۔ یہاں بیٹھو میرے سامنے، تمکین!۔۔۔ میں تمہیں بہت سارا دیکھنا چاہتا ہوں۔ اتنا کہ تمہارے یہ دلنشین نقش میری آنکھوں میں تصویر ہو جائیں۔ دل میں تو پہلے ہی تصویر ہو چکی ہو۔" وہ ذرا سا مسکرایا اور شعوری کوشش سے لہجے میں شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

تمکین یونہی نگاہیں جھکائے اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ افروز نے اپنے دونوں پائوں بیڈ پر رکھ لئے تھے اور اب بیڈ کرائون سے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہاں پائوں اوپر کر کے بیٹھ جائو نا، میرے سامنے۔" اس نے بیڈ پر ہاتھ رکھا۔ تمکین نے بنا کچھ بولے چپلیں اُتاریں اور پائوں اوپر کر لئے۔ اب وہ آلتی پالتی مارے اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

"ہاں، اب ٹھیک ہے۔" وہ مسکرایا اور اسی کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر وہ یونہی اسے دیکھتا رہا۔ تمکین نے مضطرب ہو کر اسے دیکھا۔

"تمکین!۔۔۔ تم مجھے اتنی دیر سے کیوں ملیں؟ اور اگر دیر سے ہی ملی تھیں تو اللہ نے مجھے اتنی تھوڑی مہلت کیوں دی، تمہارے ساتھ رہنے کی؟" اُس کی آواز بھرا گئی تھی۔ تمکین ہاتھ گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

"ایک ماہ۔۔۔ صرف ایک ماہ میں تمہارے حوالے سے میں نے کتنے خواب دیکھ ڈالے تھے۔ پہلی نظر میں تم مجھے بہت عام سی لگی تھیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں نے تمہیں دھیان سے دیکھا ہی کب تھا۔ لیکن ایک ماہ۔۔۔ صرف ایک ماہ بعد میں سوچ رہا تھا، تمو! اگر تم میری زندگی میں شامل نہ ہوئیں تو یہ زندگی بالکل بے کار ہے، بلکہ اس زندگی کی ضرورت بھی کیا ہے، جس میں تمہاری رفاقت نہ ہو گی۔ اور جب آپی نے کہا تھا، افروز! بہت سال پہلے ابی جان نے اپنے کسی دوست کے بیٹے سے تمکین کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ وہ بہت خوش تھے اور بہت تعریف کرتے تھے۔ مجھے ایسا لگا تھا، جیسے میرا دل ڈوب جائے گا۔ ایسے ڈوبے گا کہ پھر کبھی نہیں اُبھرے گا اور اس وقت میں نے جانا تھا کہ یہ صرف پسندیدگی نہیں تھی، یہ محبت تھی، عشق تھا، میری روح جیسے کوئی جسم سے کھینچے لے جا رہا تھا۔ اتنی اذیت اس سے پہلے میں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

"آپی۔۔۔!" میں پتہ نہیں کیا کہنا چاہتا تھا، مجھے کیا کہنا تھا۔ لفظ میرے اندر ہی ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔ تب آپی نے آہستگی سے کہا تھا۔

"مرزا سعادت بیگ، ابی جان کے صرف دوست ہی نہیں، دُور پار کے عزیز بھی تھے۔ ابی جان کراچی گئے تو اچانک وہ انہیں مل گئے اور پھر ابی جان نے وہیں۔۔۔ اُن کے بیٹے سے تمو کی بات طے کر دی۔ وہ ان دنوں

اتنے خوش تھے افروز!۔۔۔اتنے خوش کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں انہیں اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔امی جان کی ڈیتھ اور میرے معذور ہونے کے بعد تو جیسے وہ مسکرانا بھی بھول گئے تھے۔"

"تمکین۔۔۔!آپی ہولے ہولے بول رہی تھیں اور میری سانس، میرے سینے میں اُلجھ رہی تھی، جیسے ابھی دم نکل جائے گا۔

"ہم تو انہیں جانتے تک نہ تھے، نہ کبھی ملے تھے۔ لیکن ابی جان خوش تھے تو ہم بھی خوش تھے۔انہوں نے منگنی کی تقریب کے لئے آنا تھا۔ابی جان نے بتایا تھا کہ پندرہ دن تک وہ سب آئیں گے۔ لیکن ہفتہ بھر بعد ہی۔۔۔" آپا جان کی آنکھیں آنسوئوں سے بھیگ گئی تھیں اور مجھے لگ رہا تھا جیسے میں کسی عدالت میں بیٹھا ہوں اور ابھی چند لمحوں کے بعد میری قسمت کا فیصلہ سنایا جانے والا ہو۔پھانسی یا۔۔۔

"ابی جان کے اچانک ہی دل میں درد اُٹھا تھا۔ہارٹ اٹیک اتنا شدید تھا کہ زندگی ہار گئی۔ابی جان کی ڈیتھ کے چھ دن بعد سعادت بیگ صاحب کا فون آیا تھا۔اور جب میں نے انہیں ابی جان کی اچانک ڈیتھ کا بتایا تو وہ ششدر رہ گئے۔انہوں نے پھر فون کرنے کو کہا تھا اور دو تین بار انہوں نے فون کیا بھی۔۔۔ہر بار انہوں نے یہی کہا کہ وہ جلد آئیں گے اور یہ کہ تمکین ان کی امانت ہے۔اس طرح تین سال گزر گئے ہیں افروز! ہر چھ ماہ بعد وہ فون کر کے کہہ دیتے تھے کہ وہ بہت جلد آئیں گے۔ان کا بیٹا ابھی ملک سے باہر ہے۔ جیسے ہی وہ آئے گا، وہ ڈائریکٹ نکاح اور رخصتی کروالیں گے۔اس دوران تمکین کے کئی رشتے آئے لیکن میں یہی سوچتی تھی

کہ ابی جان کی خواہش تھی کہ اپنے خاندان میں ہی تمو کی شادی ہو۔اور اب تو ایک سال سے ان کا فون بھی نہیں آیا۔۔۔پتہ نہیں۔"

"تو۔۔۔تو آپی؟" میں جیسے خلا میں لٹکا ہوا، اُمید و بیم کی کیفیت میں انہیں دیکھ رہا تھا۔

"مجھے سمجھ نہیں آتا، افروز!۔۔۔میری صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ میں چاہتی ہوں اپنی زندگی میں ہی تمکین کو رخصت کردوں۔ لیکن اس ایک سال میں کتنی ہی بار میں نے فون کیا ہے۔ لیکن پہلے تو بیل ہوتی رہتی تھی اور کوئی ریسیو نہیں کرتا تھا، لیکن اب اس ایک ہفتے میں، میں نے کوئی پچاس بار اسی نمبر پر رِنگ کیا ہے لیکن اب تو بیل بھی نہیں ہوتی۔ابی جان کا خیال آتا ہے تو۔۔۔پتہ نہیں، وہ لوگ کہاں چلے گئے۔ میں معذور عورت، نہ مجھے ان کے گھر کا پتہ نہ۔۔۔کروں تو کیا کروں؟" وہ بے بسی سے مجھے دیکھنے لگی تھیں اور میرا دل تمکین! یوں دھڑ دھڑ کر رہا تھا، جیسے ابھی سینے کی چار دیواری توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

"اور کیا انتظار کروں ان کا افروز! وہ تو ابی جان کی وفات کے بعد یہاں ہمارے پاس آئے تک نہیں۔ بس، فون پر تسلیاں۔۔۔میں مزید انتظار نہیں کر سکتی، افروز!" کچھ دیر بعد انہوں نے کہا تھا۔

"تم اپنی آپا اور اماں جان کو لے آئو۔ میں بہت جلد تمکین کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہوں۔"

"اور مجھے لگا تھا، تمکین! کہ جیسے مجھے کوئی بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ جیسے میں یک دم مالا مال کر دیا گیا ہوں۔ میرا جی چاہتا تھا، اُٹھ کر خوشی سے ناچنے لگوں۔ ساری کائنات مجھے اپنے ساتھ ناچتی گاتی محسوس ہو رہی تھی۔ کیا میں

اس سے پہلے کبھی اتنا خوش ہوا تھا؟ نہیں، کبھی نہیں تمکین!۔۔۔ لیکن میری خوشی کو نظر لگ گئی، تمکین! میری اپنی نظر تمکین!'' اُس کی آنکھیں آنسوئوں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔

''کوئی نظر نہیں لگی آپ کو افروز!'' تمکین نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھا۔ ''اور آپ پلیز، کچھ دیر آرام کر لیں۔ کل صبح ہمیں لاہور کے لئے نکلنا ہے۔''

''کیوں خود کو پریشان کرتی ہو، تمکین! یہ ساری دوڑ دھوپ لاحاصل ہے۔ کیا لاہور میں کوئی اور خدا ہے؟''

''ڈاکٹر توقیر خان نے کہا ہے کہ ہمیں لاہور ضرور جانا چاہئے۔ وہاں شوکت خانم میں بڑے بڑے اچھے ڈاکٹر ہیں۔''

''لیکن اچھے ڈاکٹر زندگی نہیں بڑھا سکتے، تمکین!۔۔۔ زندگی تو بس جتنی لکھی ہوئی ہے اتنی ہے اور میری زندگی۔''

''کیا آپ کو الہام ہوا ہے کہ آپ کی زندگی کتنی ہے؟'' اس نے کسی قدر جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا خبر، میں آپ سے پہلے ابھی مر جائوں۔۔۔ اگلے پل کی تو خبر نہیں کہ۔۔۔۔''

''مت کہو ایسا تمکین!'' اس نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ ''اپنی موت سے پہلے تمہاری موت کا منظر میں نہیں دیکھ پائوں گا۔''

''تو میں بھی نہیں دیکھ پائوں گی۔ آپ کیوں بار بار ایک ہی منظر میری آنکھوں کو دکھانا چاہتے ہیں؟'' اس نے کسی قدر ناراضی سے اسے دیکھا۔

''میں نے عقیل بھائی سے بات کر لی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ چلیں گے، لاہور۔ اور بس اس بارے میں کچھ اور نہیں سننا مجھے۔ اور اب آرام سے، اچھے بچوں کی طرح آنکھیں بند کر کے لیٹ جائیں۔

صبح جلدی نکلنا ہے ہمیں۔''

''کاش، میں تمہاری ان محبتوں کو دیر تک انجوائے کر سکتا۔'' ایک پھیکی سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر بکھر گئی اور اُس نے بیڈ سے نیچے اُترتی ہوئی تمکین کا ہاتھ تھام لیا۔

''اب کہاں جا رہی ہو؟ تم کمرے سے چلی جاتی ہو تو میرا دل گھبرانے لگتا ہے۔''

''ابھی آ رہی ہوں۔ آپا جان نے بی پی چیک کرنے کو کہا تھا۔''

''اچھا جائو، لیکن جلدی آنا۔ آپا جان تو بٹھا ہی لیتی ہیں تمہیں۔''

وہ دھیمے سے مسکرائی۔

''جناب! میں آپا جان کی چہیتی بھابی جو ہوں۔ بہت پیار کرتی ہیں وہ مجھ سے۔''

''مجھ سے بھی زیادہ؟''

تمکین نے نفی میں سر ہلا دیا اور پھر فوراً رُخ موڑ لیا۔ وہ کتنی کوشش کرتی تھی کہ افروز کے سامنے کسی کمزوری کا اظہار نہ کرے، بہت خوش رہے لیکن لمحہ لمحہ بھر بعد اس کے اندر جل تھل ہونے لگتی تھی اور پلکیں بھیگ جاتی تھیں۔ وہ تیزی سے باہر نکلتی چلی گئی۔ بند دروازے پر ایک حسرت بھری نظر ڈال کر افروز نے نیم دراز ہوتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور بند آنکھوں کے سامنے وہ دن آگیا، جب پہلی بار اس نے تمکین کو دیکھا تھا۔

VVV

اُس روز وہ عقیل سے ملنے ایبٹ آباد گیا تھا۔ اُسے گھر آئے تقریباً بیس دن ہو چکے تھے اور ان بیس دنوں میں عقیل نے دو چکر پھلکوٹ کے لگائے تھے اور اب ایک ہفتے سے مسلسل اسے پیغام بھجوا رہا تھا کہ وہ کچھ دن اُس کے پاس ایبٹ آباد آکر رہے۔ ایک دو گھنٹے کی ملاقات میں اتنے برسوں کی جدائی کی تشنگی نہیں مٹتی۔ وہ تقریباً آٹھ سالوں بعد پاکستان آیا تھا۔ ان آٹھ سالوں میں ایک بار وہ صرف تین دنوں کے لئے اپنے بابا کی وفات پر آیا تھا۔ صرف تین دن پھلکوٹ اور دو دن اسلام آباد میں رہ کر وہ واپس چلا گیا تھا۔ سو وہ خود بھی عقیل کے ساتھ بہت سا وقت گزارنا چاہتا تھا۔ بہت ساری باتیں اسے عقیل اور ماموں جان سے پوچھنی تھیں لیکن یہاں آتے ہی وہ اُلجھ گیا۔

بہت سارے معاملات اُس کی سمجھ سے باہر تھے۔ اس پر اماں جان کی اچانک بیماری۔ سو وہ نکل ہی نہیں پا رہا تھا۔

آج بھی وہ گھر سے نکل آیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ کچھ دیر عقیل کے ساتھ رہے گا۔ اُسے اپنے لئے سیل فون لینا تھا۔ وہاں والا فون تو یہاں کام نہیں کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی اچھی کمپنی کا کنکشن لے لے، جس کے سگنل اوپر پھلکوٹ میں بھی کلیئر ہوں۔ گھر میں فون کی سہولت بھی نہیں تھی۔ اُسے ایبٹ آباد جا کر کچھ ضروری کالیں بھی کرنی تھیں اور فون کے متعلق بھی معلومات لینا تھیں کہ کیا پھلکوٹ میں لینڈ لائن کی سہولت مل سکے گی؟ جب وہ گیا تو ایسی کوئی سہولت نہ تھی۔ بابا ہمیشہ ایبٹ آباد آکر اسے فون کرتے تھے۔ آپا نے بہت تاکید کی تھی کہ وہ رات تک ضرور پلٹ آئے۔

"اتنا عرصہ ہم اکیلے رہے ہیں، لیکن اب تم اِدھر اُدھر ہوتے ہو تو دل گھبرانے لگتا ہے۔ افروز! تمہارے بہنوئی بھی مہینے کے اٹھائیس دن تو لاہور اور پنڈی میں رہتے ہیں۔ یہاں میں اور اماں اکیلی روحوں کی طرح اس گھر میں چکراتی پھرتی ہیں۔ جلدی آجانا۔"

سو اُس نے عقیل کے پاس پہنچتے ہی اُسے بتا دیا تھا کہ وہ شام کو چلا جائے گا۔

"ہیں، کیا تم ابا جان سے نہیں ملو گے؟ وہ ہری پور گئے ہیں، خدیجہ سے ملنے۔ بہت دن ہو گئے وہ یہاں نہیں آئی تو بس ابا جان اور امی جان اُداس ہو رہے تھے، اس لئے ملنے چلے گئے۔"

''یار! میرا ابھی بہت دل چاہ رہا ہے اس سے ملنے کو۔۔۔ یاد ہے نا، امتحان کے دنوں میں ہماری کتنی خدمتیں کرتی تھی۔۔۔ کبھی کافی بن رہی ہے، کبھی چائے اور کبھی پکوڑے بنا کر لا رہی ہے۔ سچی، کبھی کبھی وہاں جب پڑھتے ہوئے کافی کی خواہش ہوتی تھی تو وہ مجھے یاد آتی تھی۔''

''وہ بھی اکثر تمہیں بہت یاد کرتی تھی۔ کہتی تھی، افروز بھائی جب تک نہیں آئیں گے، شادی نہیں کرائوں گی۔ اور پھر شادی کرالی۔''

وہ ہولے سے ہنسا تھا۔

''اور دو بچوں کی اماں محترمہ بھی بن گئیں۔ میں دو روز تک پھر آئوں گا تو ہری پور چلیں گے۔''

''تو آج کیوں نہیں رک جاتے یار؟''

''آپا سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ لوٹ آئوں گا۔ خوامخواہ پریشان ہوتی رہیں گی۔''

''نہیں ہوں گی پریشان۔۔۔ پہلے کون سا تم ان کے پاس رہے تھے۔''

''ہاں، لیکن ان پندرہ دنوں میں تو آپا اور اماں ایک منٹ کے لئے بھی مجھے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔ اب ان کا میرے سوا ہے ہی کون؟ پھر بابا جان ہی نہیں رہے، جن کی مجھ سے حد درجہ چاہت پر وہ مجھ سے خفا رہتی تھیں۔''

''خیر اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ یہ بتائو اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟ کیا یہیں رہو گے یا پھر واپس چلے جائو گے امریکہ؟''

''پتہ نہیں، ابھی میں نے کچھ فیصلہ نہیں کیا۔ شاید چلا جائوں، شاید رہ جائوں۔ جب میں بابا جان کی وفات پر آیا تھا تو میں نے عہد کیا تھا کہ اب کبھی لوٹ کر پاکستان نہیں آئوں گا اور کس کے لئے آئوں گا، کون ہے میرا یہاں؟ لیکن دیکھو، آٹھ سال بعد مجھے آنا پڑا۔''

''تمہارا آنا بہت ضروری تھا، افروز!'' عقیل سنجیدہ ہو گیا۔ ''بلکہ تمہیں بہت پہلے آجانا چاہئے تھا۔ میں نے تمہیں کتنے خط لکھے، فون کئے کہ صرف کچھ دنوں کے لئے ہی آجائو۔ لیکن تم۔۔۔''

''خیر، اب تو آگیا ہوں۔ حالانکہ میرا ارادہ نہیں تھا آنے کا۔ بابا جان اتنے بیمار ہوئے، ہسپتال میں رہے اور مجھے کسی نے بتایا تک نہیں۔ تم نے اور ماموں جان نے بھی اطلاع نہیں دی۔ میں کم از کم ان کی زندگی میں ہی آجاتا۔ انہیں چلے ہی جانا تھا، میں ان سے مل لیتا، باتیں کر لیتا۔ شیر زمان نے مجھے بتایا تھا کہ وہ آخری لمحے تک میرے منتظر رہے تھے۔ ان کی نظریں دروازے پر ہی لگی رہی تھیں۔ وہ کہتا تھا انہوں نے آپا اور اماں کو بہت کہا کہ وہ مجھے ان کی بیماری کی اطلاع دے دیں، لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ تم نے اور ماموں جان نے بھی خبر نہیں کی۔''

"بخدا، افروز! ہمیں خود علم نہیں تھا۔ میں تو اسلام آباد میں تھا، لیکن ابا جان تو ادھر ہی تھے۔ نہ آپا نے، نہ پھلکوٹ سے کسی اور نے خبر دی کہ بابا بیمار ہیں۔ اور یہاں ایبٹ آباد میں ہی ہسپتال میں ہیں۔ دراصل شاید آپا اور اماں نہیں چاہتی تھیں کہ۔۔۔۔"

"خیر، جو ہوا سو ہوا۔" افروز نے اسے ٹوک دیا۔ "یہ میری بدنصیبی تھی کہ میں اپنے باپ کے جنازے کو کندھا تک نہ دے سکا۔ اگر تم فون نہ کرتے تو۔۔۔۔"

"ہمیں بھی تو اتفاقاً ہی پتہ چلا تھا۔ شیر زمان، ابا جان کو ہسپتال سے باہر روتا ہوا مل گیا تھا۔ ابا جان تو پہلے یہی سمجھے کہ شاید اس کا کوئی عزیز فوت ہو گیا ہے۔۔ وہ تو مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنا تھیں، لیکن تم تو تین دن بعد ہم سے ملے بنا ہی واپس چلے گئے تھے۔"

"ہاں، میں بہت ڈس ہارٹ ہو گیا تھا۔ ایک دم زندگی سے بھی بیزار ہو گیا تھا۔ اور پھر میں اپنا سمسٹر چھوڑ کر آیا تھا، مجھے جانا تو تھا ہی۔"

"ہاں، لیکن تمہیں کچھ تو دیکھنا چاہئے تھا۔ اپنی پراپرٹی، بینک بیلنس۔"

"چلو، اب آ گیا ہوں نا۔ بابا جان کے وکیل نے اتنے فون کئے کہ آنا ہی پڑا۔" افروز مسکرایا۔

"پھر ملاقات ہوئی؟" عقیل نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔۔ کچھ جائیداد تو آپا بتا رہی تھیں کہ بابا جان نے اپنی زندگی میں ہی فروخت کر دی تھی۔ کچھ ہے، جس کا کرایہ وغیرہ آ رہا ہے۔"

"جھوٹ۔ بالکل جھوٹ۔۔۔۔!" عقیل نے جوش سے کہا۔ "بابا جان نے کچھ بھی فروخت نہیں کیا تھا۔ لاہور میں جو نئے ایئرپورٹ کی طرف زمین تھی اُن کی، اُس کی قیمت لاکھوں میں بڑھ گئی تھی اور پلاٹ بنا کر یہ زمین آپا کے میاں نے فروخت کی ہے۔ افروز!۔۔۔۔ کروڑوں کی جائیداد تھی وہ۔ میں نے ہی وکیل صاحب کو تمہارا نمبر دیا تھا۔ سب جعلی کام ہے، افروز! جعلی مختار نامہ۔ میں نہیں جانتا کیا کچھ بچ گیا ہے، لیکن مجھے اور ابا جان کو دکھ ہوتا تھا کہ یہ تمہارا حق تھا۔"

"چھوڑو یار! مجھے کیا کرنا ہے۔ میرے پاس بہت ہے۔ ویسے بوسٹن میں میرا ذاتی گھر ہے، گاڑی ہے، اچھی جاب ہے۔" افروز نے بے پروائی سے کہا۔

"لیکن اپنا حق نہیں چھوڑنا چاہئے۔ وہ نادر خان کون ہوتا ہے؟ کوئی حق نہیں ہے اُس کا، تمہاری جائیداد پر۔" عقیل کو غصہ تھا۔

"چھوڑو بھی یار! چلو میرے ساتھ بازار۔ مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔" وہ اسے ساتھ لے کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ شاپنگ کے بعد چائے وغیرہ سے فارغ ہوتے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔

"آج یہیں رک جائو افروز! ایک تو موسم بھی خراب ہو چلا ہے۔۔۔ شاید بارش ہو۔ دوسرے دو میل سے اُدھر راستوں میں جو جنگل ہیں، وہاں سے شیر اکثر ہی آبادی میں آجاتے ہیں۔ دس پندرہ دن سے، ہر دوسرے تیسرے دن مویشی اٹھا کر لے جاتے ہیں۔" عقیل نے اسے روکنا چاہا تھا۔

"یہ کیا بے پَر کی اُڑا رہے ہو؟ مجھے تو آئے پندرہ دن ہو گئے۔ میں نے تو ابھی تک کوئی شیر نہیں دیکھا۔" افروز ہنسا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا۔ پچھلے اتوار میں خود جھلگراں میں تھا۔ وہاں تو شام کے بعد کوئی گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ چھ ہی بجے تھے کہ باہر شور مچ گیا کہ شیر کسی کی بکری اٹھا کر لے گیا ہے۔"

"تو اس کے لئے لوگوں نے کچھ نہیں کیا؟" افروز نے حیرت سے پوچھا۔

"درخواستیں تو دی ہیں، محکمہ جنگلات کے ذمہ دار افراد کو۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ عموماً تو یہ آبادیوں کا رخ نہیں کرتے۔ کئی سال پہلے بھی ایک جوڑا شیروں کا یوں ہی مویشی اٹھا کر لے جاتا تھا۔ تب دارالحکومت سے شکاری آئے تھے۔" عقیل نے تفصیل بتائی۔

"پہاڑوں کا بیٹا ہوں۔ کیا ہوا جو اتنا عرصہ ملک سے باہر رہا۔ اب شیروں کے خوف سے یہاں چھپ کر بیٹھ جائوں؟ اماں کا بی پی تو پہلے ہی ہائی رہتا ہے۔ نہ پہنچا تو پریشانی سے اور بڑھ جائے گا۔"

"یہ تمہارے نادر خان درانی لاہور میں رہتے ہیں تو کیا انہوں نے اپنی بیگم کو کوئی سیل فون وغیرہ نہیں لے کر دیا؟ ایک دو کمپنیاں ہیں، جن کی سروس اچھی ہے اور یہاں ہمارے علاقے میں بھی مہیا ہے۔"

"پتہ نہیں۔" افروز نے کندھے اچکائے۔ "میں نے تو کبھی آپا کو ان پندرہ دنوں میں موبائل فون استعمال کرتے نہیں دیکھا۔"

"احتیاط سے ڈرائیو کرنا۔ تم طویل عرصے بعد یہاں ڈرائیو کر رہے ہو۔ یہاں ڈرائیونگ اتنی آسان نہیں۔"

"کچھ نہیں بھولا میں۔ سب موڑ، راستے مجھے ازبر ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے جیپ اسٹارٹ کی تھی۔

ایبٹ آباد سٹی سے پھلکوٹ تک تقریباً تین ساڑھے تین گھنٹے کا راستہ تھا۔ لیکن ابھی وہ دو میل اڈے سے نکل کر تھوڑا ہی آگے گیا تھا کہ اس نے سڑک کے کنارے کسی کو گرے ہوئے دیکھا تو بے اختیار جیپ روک لی۔ سڑک بھی کیا تھی، چھوٹی سی پگڈنڈی تھی۔ ایک طرف اونچے پہاڑ اور دوسری طرف کھائیاں۔

شام گہری ہو چلی تھی اور ایسے میں یہ کون تھا؟ کہیں کسی مسافر پر شیر نے تو حملہ نہیں کر دیا؟

بڑے محتاط انداز میں جیپ سے اتر کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اس کی طرف بڑھا۔

"اوہ میرے خدا۔۔۔!"

وہ کوئی زخمی لڑکی تھی۔

"یہ زخمی لڑکی یہاں کیسے آئی؟" اُس نے جھک کر اُسے سیدھا کیا۔ وہ ہلکے ہلکے سانس لے رہی تھی۔

'یہ زندہ ہے۔'

اُس نے ایک اطمینان بھری سانس لی اور سیدھے ہوتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔اس لڑکی کو فوراً طبّی امداد کی ضرورت تھی۔ تبھی اُس کی نظر ایک چھوٹے سے ٹیلے سے اُترتے دو بچوں پر پڑی۔ وہ اچھلتے کودتے نیچے آرہے تھے۔

''اے،اِدھر آئو۔''

بچوں نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور اس کی طرف بڑھ گئے تھے۔ پھر اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بتانے لگے۔

''ادھر نیچے کھائی میں جیپ گر گئی ہے۔ میں نے خود دیکھا، جب جیپ پہلے اچھلی، اُلٹی ہوئی، پھر سیدھی۔اُس کا دروازہ کھل گیا تھا اور یہ ادھر باہر گر گئی اور جیپ نیچے۔ میرا ابا نیچے اُترا ہے، دیکھنے کے لئے ہم اوپر ٹیلے سے دیکھ رہے تھے۔ وہ آرہا ہے واپس۔'' لڑکا خاصا باتونی لگ رہا تھا۔

''ہے بابا۔۔۔۔ہے۔'' اُس نے دونوں ہاتھوں کا بھونپو سا بنا کر اونچی آواز میں پکارا۔

افروز حیران سا کھڑا کبھی زخمی لڑکی کو دیکھتا اور کبھی بچوں کی طرف۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ کچھ دیر بعد اس نے کنارے پر ہاتھ رکھ کر ایک شخص کو اوپر سڑک پر آتے دیکھا۔ دونوں بچوں نے دوڑ کر سہارے کے لئے اُس کا ہاتھ پکڑا تھا۔

''وہ، نیچے کوئی مسافر زندہ ہے؟'' افروز نے پریشانی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس شخص نے نفی میں سر ہلایا۔

''ایک ہی بندہ ہے جیپ میں، ڈرائیور۔ جو مر گیا ہے۔ جیپ درختوں میں اٹک گئی ہے۔ نیچے گہرائی میں گر جاتی تو پھر تو بہت مشکل تھا، لیکن اب۔۔۔۔آپ کے پاس جیپ ہے نا۔۔۔۔یہ لڑکی۔۔۔۔''

''ہاں۔۔۔۔'' افروز چونکا تھا اور پھر اس شخص کی مدد سے اس نے لڑکی کو جیپ میں ڈالا۔

''کوئی قریب ترین کلینک، یا۔۔۔۔''

''ایبٹ آباد ہی لے جانا پڑے گا۔ یہاں تو نہیں۔''

افروز نے انہیں بھی بٹھا لیا تھا۔ جیب وہاں سے تو اب مڑ نہیں سکتی تھی۔ اتنی تنگ سڑک تھی۔

''آگے دائیں طرف ہمارا گائوں ہے، ہمیں وہاں اُتار دیں۔ وہاں سے بندے لے کر اور روشنی کا انتظام کر کے میں آتا ہوں، لاش لے جانے کے لئے۔ اپنا جاننے والا ہے یہ ڈرائیور۔ ادھر دو میل اڈے سے جیپ پر لوگوں کو ادھر لاتا، لے جاتا ہے۔ اور بی بی کو آپ ایبٹ آباد لے جائیں۔ ادھر آگے ہمارے گائوں سے ہی ٹرن لیجئے گا۔''

افروز کو بے حد گھبراہٹ ہو رہی تھی لیکن اس گھبراہٹ پر انسانی ہمدردی غالب آگئی۔ ایک بار تو اس نے سوچا تھا کہ وہ اس خاتون کو بھی وہاں گائوں میں ان کے حوالے کرے اور خود چھلکوٹ کی طرف نکل جائے۔ لیکن پھر وہ ایسا نہیں کر سکا تھا۔

ایبٹ آباد پہنچ کر اس نے عقیل کو فون کر کے تفصیل بتائی۔ کچھ دیر بعد ہی عقیل ہسپتال پہنچ گیا تھا اور اس کے آجانے سے افروز کو بھی بہت سہارا ملا تھا۔ کیونکہ عقیل کے کافی جاننے والے تھے۔

''اللہ جانے کون ہے۔اس کے گھر والوں کو کیسے اطلاع دی جائے؟ساتھ میں کوئی پرس وغیرہ بھی نہیں۔''

افروز تھوڑا پریشان تھا۔

''وہ تو لڑکی کے ہوش میں آنے کے بعد ہی کچھ ہو سکتا ہے۔تمہارا کیا خیال ہے،اب گھر ہی چلو۔ پھلکوٹ تو اب کل ہی جا سکو گے تم۔اس وقت تو میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔''

''ہاں،وہ تو ٹھیک ہے۔لیکن لڑکی کو اس حالت میں چھوڑ کر کیسے چلے جائیں؟''

''تم لڑکی کو یہاں لے آئے ہو۔تمہارا فرض تو ادا ہو گیا ہے۔''

''نہیں یار!میرا دل نہیں مان رہا۔'' افروز متذبذب تھا۔

''اوکے۔۔۔۔میں پتہ کرتا ہوں ڈاکٹر سے کہ کیا پوزیشن ہے۔'' عقیل،افروز کو وہاں چھوڑ کر چلا گیا تو افروز لائونج میں ہی ایک طرف بیٹھ گیا۔اس کا دل گوارہ نہیں کر رہا تھا کہ وہ یوں اس لڑکی کو بے یارو مددگار چھوڑ کر چلا جائے۔

''پتہ نہیں،لڑکی ہوش میں آئی بھی ہے یا نہیں۔''

اور یہاں کے ہسپتالوں کا اسے اچھی طرح علم تھا کہ لاوارثوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔اب تو ڈاکٹر کچھ توجہ دے رہے ہیں۔اور پھر جب وہ آیا تھا،کتنی ہی بار دوائیاں منگوائی گئی تھیں۔

''اور اگر ہمارے جانے کے بعد کسی دوائی کی ضرورت پڑ گئی تو؟۔۔۔نہیں،عقیل بھلے چلا جائے،میں یہاں ہی رہوں گا۔'' افروز نے دل ہی دل میں سوچا۔

''جب تک لڑکی کے گھر والے نہیں آجاتے،کم از کم تب تک مجھے یہاں ہی ٹھہرنا چاہئے۔'' دل ہی دل میں فیصلہ کرتے ہوئے مطمئن سا ہو کر اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔ تبھی عقیل واپس آ گیا۔

''کیسی ہے وہ لڑکی؟'' افروز نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ابھی ہوش میں نہیں آئی لیکن ڈاکٹر احسان سے میری تفصیل سے بات ہوئی ہے۔وہ کہہ رہے ہیں،خدا نے بچا لیا ہے۔معمولی سا فریکچر ہے بازو میں۔اور سر کے پچھلے حصے میں شاید کوئی پتھر کا کونا لگا۔بہر حال،گہرا زخم نہیں ہے۔امید ہے جلد ہی ہوش میں آجائے گا۔''

وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور پاکٹ سے اپنا سیل فون نکالا۔

''دوسرا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔یہ تمکین آرا ہے۔تمہیں یاد ہے نا۔۔۔۔ ہمارے گھر کی بیک پر ہی توان کا گھر ہے۔''

افروز کو بہت یاد کرنے کے باوجود اس نام کی کوئی لڑکی یاد نہیں آرہی تھی۔حالانکہ اس نے ایف ایس سی تک اپنی تمام تعلیم یہاں،ایبٹ آباد میں عقیل کے گھر میں ہی رہ کر حاصل کی تھی اور آس پاس کے تقریباً سب ہی گھروں میں ان کا آنا جانا تھا۔وہ عقیل کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔جبکہ عقیل اب فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

"آپی! یہ میں ہوں، عقیل۔۔۔۔ تمکین کا معمولی سا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔۔۔۔وہ یہاں، ہسپتال میں ہے۔۔۔۔"

"نہیں، نہیں۔۔۔۔آپ پریشان نہ ہوں بالکل۔اور آپ یہاں کیسے آئیں گی؟ میں ہوں نا یہاں۔آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔"

"نہیں، ابھی تمکین سے بات نہیں ہو سکتی۔۔۔۔اور پلیز آپی! کسی قسم کی ٹینشن مت لیں۔"

فون آف کر کے اُس نے افروز کی طرف دیکھا۔

"یار! تمہیں وہ یاد ہیں نا، مرزا ہمایوں بیگ۔ وہی جن کے گھر ہم کبھی مین گیٹ سے نہیں گئے تھے۔ ہمیشہ چھت سے کود کر جاتے تھے اور وہ ہمیشہ کہتے تھے، بچو! میرے گھر کا ایک مین گیٹ بھی ہے اور شریف آدمی ہمیشہ سیدھے راستے سے آتے ہیں اور۔۔۔۔اور ہم بالکل بھی شریف نہیں تھے۔"

افروز ہنسا۔اُسے یاد آ گیا تھا۔

"دو بیٹیاں تھیں اُن کی۔یار! ایک وہ تسکین آپی تھیں، جو ہمیں مزے مزے کی چیزیں بنا کر کھلاتی تھیں اور ایک وہ تھی چھوٹی، تمو۔۔۔۔ہاں، تمو۔"

"تو یہ، تمو ہی ہے نا۔۔۔۔ تمکین آرا۔" عقیل نے بتایا اور افروز کو یاد آ گیا۔ سانولی سلونی سی تمو، جس کی آنکھیں بہت خوب صورت تھی۔ مغل شہزادیوں جیسی آنکھیں۔ جب وہ چھوٹی تھی تو وہ اکثر اسے گود میں اٹھا

کر چپ کروایا کرتا تھا۔ وہ بہت روتی تھی۔ ذرا سی بات پر جو روتی تھی تو پھر چپ ہی نہیں کرتی تھی۔ لیکن اُس کی گود میں آتے ہی وہ چپ کر جاتی تھی۔ تب آپی بہت حیران ہوتی تھیں۔

"اُفی! کیا پھونکتے ہو تم اس کے کان میں کہ۔۔۔۔"

"جادو ہے جی، جادو ہمارے پاس۔" وہ موٹی، صحت مند تمو کو گدگدی کرتا تو وہ کھل کھل کر ہنسنے لگتی تھی۔

جب وہ ایف ایس سی کے بعد لاہور گیا، تب وہ بارہ سال کی تھی۔ اور پھر اس کے بعد اس نے تمو کو نہیں دیکھا تھا۔ بی ایس سی کے بعد باباجان نے اُسے امریکہ بھیج دیا تھا، پڑھنے کے لئے۔ اور اب اتنے سالوں بعد وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کا نام سن رہا تھا۔ تو یہ تمو تھی۔۔۔۔ یعنی تمکین آرا۔

VVV

"تمکین۔۔۔۔"

اُس نے ایک دم آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔

"اور یہ آپا بھی بٹھا لیتی ہیں۔ ذرا خیال نہیں کرتیں میرا کہ مجھے۔۔۔۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ابھی اُٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ تمکین اندر داخل ہو رہی تھی۔

"اتنی دیر؟" اُس نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"وہ، آپا نے آنے نہیں دیا۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ افروز نے بغور اُسے دیکھا۔ اُس کی پلکیں اب بھی بھیگی بھیگی تھیں اور چہرے پر اُداسی تھی۔

'یہ آپا اور اماں بھی بس ہر وقت میری موت کا ذکر کر کر کے اسے دہلائے رکھتی ہیں۔۔۔۔ کتنی اُداس رہنے لگی ہے۔'

"آپ سوئے نہیں ابھی تک؟" واش روم کی طرف مڑتے مڑتے اُس نے پوچھا۔

"تمہارا انتظار کر رہا تھا۔" لہجے میں ہلکی خفگی تھی۔ "میں نے کہا تھا نا تم سے، کہ ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔ تمکین! میرا جی چاہتا ہے کہ ان بچے لمحوں کا ہر لمحہ تمہارے سنگ، تمہاری رفاقت میں تمہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے گزاروں۔ میرے اختیار میں ہو تو میں پلک بھی نہ جھپکوں۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں کا ہر لمحہ۔۔۔۔"

"نیند بھی تو ضروری ہے۔" اس نے لہجے میں خوشگواری پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"لیکن مجھے۔۔۔۔ آج نہیں سونا، تمکین!" اس نے ضدی لہجے میں کہا تھا۔ "اب سونا ہی ہے نا، باقی زندگی۔"

"افروز۔۔۔۔!" اُس نے ایک خفگی بھری نظر اُس پر ڈالی۔ "ایسی باتیں نہیں ہوں گی۔"

"اچھا پرامس، ایسی باتیں نہیں ہوں گی۔" وہ مسکرایا۔ "ہم صرف محبت کی باتیں کریں گے اور جب میں نہیں رہوں گا تو یہ باتیں۔۔۔۔" ناراض ناراض نظروں سے اُسے دیکھتی ہوئی وہ واش روم کا دروازہ زور سے بند کرتی اندر چلی گئی تو وہ یونہی مدھم سی مسکراہٹ لبوں پر لئے گنگنانے لگا۔

دن زندگی کے کٹ گئے اور شام بھی

پھیلا کے پاؤں سوئیں گے کنجِ مزار میں

پھیلا کے پاؤں سوئیں گے کنجِ مزار میں

وہ آنکھیں موندے گنگنا رہا تھا، جب تمکین کپڑے چینج کر کے باہر نکلی اور ٹھٹک کر رہ گئی۔ دل کو جیسے کسی نے یک دم مٹھی میں لے لیا تھا۔

'کیا تھا اللہ میاں!۔۔۔۔ کیا تھا، اگر افروز کو کچھ نہ ہوتا۔' اُس نے دل ہی دل میں شکوہ کیا۔

'لوگ کتنے خوش اور مطمئن ہوتے ہیں۔ زندگی کی ہر خوشی ان کے پاس ہوتی ہے۔۔۔۔ سارے رشتے ہوتے ہیں۔ دو تین سال کی عمر میں ماں چلی گئی اور پھر جوان ہوئی تو ابا جان چلے گئے۔ آپی کتنی خوب صورت، کتنی

ذہین تھیں، معذوری دے دی اُن کو۔ اور اب۔۔۔ افروز۔۔۔ نہیں میرے اللہ! نہیں۔" آنسو بے حد خاموشی سے رخساروں پر بہنے لگے تھے۔

"پھیلا کے پاؤں سوئیں گے'

یکایک اُسے احساس ہوا کہ تمکین کمرے میں آچکی ہے، سو مصرعہ اُدھورا چھوڑ کر اس نے یک دم آنکھیں کھول دیں۔

"تم پھر رو رہی ہو؟" وہ بے حد دل گرفتگی سے کہہ رہا تھا۔ "کتنی بار تمہیں بتاؤں، تمہارے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔ میں تمہاری نم آنکھیں تصور میں بسا کر اس دنیا سے رخصت نہیں ہونا چاہتا۔ تم یوں ہمہ وقت روتی رہو گی تو میں خود اپنی زندگی ختم کر لوں گا۔ نہیں دیکھ سکتا ان آنکھوں میں آنسو۔ کیسے دیکھوں، جس چہرے پر میں نے تصور ہی تصور میں سینکڑوں طرح کی مسکراہٹیں چسپاں کر کے دیکھی ہوں، اسے کیسے آنسوؤں میں بھیگا دیکھوں تمکین!"

"آپ۔۔۔ آپ کیوں گا رہے تھے یہ؟" ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھتی، ناراضی سے کہتی وہ اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

"یہ۔۔۔ بہادر شاہ ظفر کی غزل کا ایک شعر ہے۔ یونہی زبان پر آگیا۔ تمہیں پسند نہیں تو نہیں گاتے۔

بہارو پھول برسائو، میرا محبوب آیا ہے

یہ سنو گی؟" وہ بہت گہری نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اِدھر، یہاں آئو میرے پاس۔ میرے قریب بیٹھو۔ مجھ سے دور دور کیوں رہتی ہو؟ کیا میرا مرض چھوت کا ہے، جو تمہیں لگ جائے گا؟"

"کاش لگ جائے۔۔۔ کاش میں۔۔۔"

یک دم بہت سارے آنسوئوں نے حلق بند کر دیا تھا۔ اس نے ناراضی اور خفگی سے اپنا ہاتھ افروز سے چھڑا لیا۔

"سوری تمکین! پتہ نہیں کیوں، کبھی کبھی منہ سے یونہی بے ارادہ کچھ نکل جاتا ہے۔ آئی ایم رئیلی ویری سوری، تمکین۔ سنو تمکین! آج جتنا رونا ہے، رو لو۔ یہ سینہ تمہارا ہے، جتنا چاہے بھگو لو۔ بہت کھل کر برس لو۔ میں تمہیں سنبھال لوں گا اور تمہارے آنسو بھی سمیٹ لوں گا۔ میں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا ہے کہ ہمارا ساتھ بس اتنا ہی تھا، مختصر۔ تم بھی اس حقیقت کو قبول کر لو کہ کتابِ زندگی میں ہمارے لئے ایسے ہی لکھا گیا تھا۔ میرے بعد کبھی نہ رونا۔ نہ میرے سامنے، نہ میرے بعد۔۔۔ یہ دنیا بہت کھردری ہے تمکین! تمہارے بہتے آنسوئوں اور اذیت کو یہ تمہاری کمزوری جانیں گے اور تمہارے لئے بھیڑیے بن جائیں گے۔ میں کچھ ایسا ضرور کر جائوں گا کہ تمہیں میرے بعد۔۔۔"

"افروز!۔۔۔ افی! پلیز۔۔۔ پلیز!" ایک بار پھر وہ زور زور سے رونے لگی تھی اور اسے اپنے ساتھ لگائے وہ ہولے ہولے تھپک رہا تھا اور اس کے آنسو اسے جل تھل کیے جا رہے تھے۔ لیکن وہ بے انتہا ضبط کئے اسے اپنے بازوئوں میں سمیٹے اسے رونے دے رہا تھا۔

'کتنا سکون۔۔۔ کتنی طمانیت ہے افروز کے قرب میں۔'

ہولے ہولے اُس کے آنسو تھمنے لگے تھے۔ لیکن وہ یونہی اس کے سینے پر سر رکھے، آنکھیں موندے سسک رہی تھی۔

VVV

اُس روز جب آپی نے اُسے افروز کے پرپوزل کا بتایا تھا تو کتنی خوش ہوئی تھی اور اُسے اپنی خوش قسمتی پر کتنا رشک آیا تھا۔ افروز نے اُسے پرپوز کیا تھا۔ وہ افروز، جو بچپن میں بھی اُسے بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ روتی تھی تو وہ اُسے چاکلیٹ کھانے کو دیتا تھا۔ پھر وہ چلا گیا۔ کتنے بہت سارے دن اُس نے چپکے چپکے اُسے یاد کیا تھا۔ اور پھر اتنے سالوں بعد اچانک اُسے ہسپتال میں، اپنے بیڈ کے سامنے اسٹول پر بیٹھے دیکھ کر وہ بالکل بھی پہچان نہیں سکی تھی۔ تب پاس کھڑے عقیل نے بتایا تھا۔

"تمکین! پہچانا اسے؟"

اور اُس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"یہ افروز ہے۔ یاد ہے نا؟"

اور وہ حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

پھر جب وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر گئی تھی تو تب بھی وہ گھر آیا تھا۔ اور پھر ایک دو ماہ میں وہ کتنی ہی بار گھر آیا تھا۔ اس کے آنے سے ان کے ویران گھر میں جیسے رونق سی آجاتی تھی۔ ابی جان کے جانے کے بعد کتنی اُداسی پھیلی رہتی تھی، گھر میں۔

بی ایڈ کرنے کے بعد اس نے درامنی کے ایک پرائمری اسکول میں جاب کر لی تھی۔ وہاں ہی پڑھاتی تھی۔ اُس روز اُسے دیر ہو گئی تھی۔ چھٹی کے بعد وہ ایک مقامی ٹیچر کے گھر چلی گئی تھی۔ اپیا کو اس نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ دیر ہو جائے گی۔ اور پھر وہ حادثہ اور اس حادثے میں یوں اچانک افروز کا ملنا کس قدر افسانوی سا تھا۔ آپی بھی افروز سے مل کر بہت خوش تھیں۔ تسکین آپی کتنی خوب صورت،، کتنی ذہین تھیں۔ لیکن ان کے ساتھ کوئی ایسا پیدائشی مسئلہ تھا کہ شروع شروع میں تو وہ چلتے چلتے گر جاتی تھیں۔ لیکن پھر بارہ سال کی عمر میں تو وہ وہیل چیئر پر آگئی تھیں۔ ابی جان نے اُن کی تعلیم کا خود خیال رکھا تھا اور پاکستان میں تقریباً ہر بڑے شہر کے ڈاکٹرز سے رجوع کیا تھا۔ لیکن کسی نے کوئی حوصلہ افزا بات نہیں کی تھی۔ وہ اس سے کچھ زیادہ بڑی تو نہ تھیں۔ سات، آٹھ سال ہی بڑی ہوں گی۔ لیکن امی جان کی وفات کے بعد انہوں نے ہی اس کا خیال رکھا تھا۔ وہ چھ سات سال کی تو تھی جب امی جان کی وفات ہوئی تھی۔ اور آپی کا سوچ کر افروز کی رفاقت کی خوشی مٹ سی گئی تھی۔

"نہیں آپی! میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔" اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔

"پاگل ہوئی ہو؟۔۔۔ میں کہاں اکیلی ہوں؟ بوا تو ہے نا میرے پاس۔اور پھر میں چاہتی ہوں، بہت جلد تمہیں کسی محفوظ ہاتھ میں دے دوں۔ چندا! پتہ نہیں کیوں، مجھے لگتا ہے جیسے میرے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ میری خواہش تو تھی کہ تمہاری شادی وہاں ہی ہوتی جہاں ابا کی خواہش تھی۔ لیکن میں مزید انتظار نہیں کر سکتی، تمو! اور افروز پر مجھے بھروسہ ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لئے محبت دیکھی ہے۔ مجھے یقین ہے وہ تمہارا بہت خیال رکھے گا۔ بہت چاہے گا تمہیں۔"

آپی نے اس کی کوئی بات نہیں سنی تھی۔اور صرف پندرہ دن بعد وہ افروز کے سنگ دُلہن بنی، پھلکوٹ کی طرف سفر کر رہی تھی۔

شادی بہت سادگی سے ہوئی تھی۔افروز کی اماں، آپا اور بہنوئی کے علاوہ صرف عقیل کی فیملی کے لوگ تھے۔

"افروز کی اماں اور آپا مجھے اس شادی سے خوش نہیں لگتیں، تمو!" آپی نے اس سے کہا تھا، جب پہلی بار افروز انہیں ان کے گھر لایا تھا۔

"دراصل اماں اُس کی سگی ماں نہیں ہیں۔اور آپا بھی اماں کی بیٹی ہیں، ان کے پہلے خاوند سے۔" آپی نے بتایا تھا۔

"لیکن تم اپنی محبت اور خدمت سے ان کے دل جیت لینا۔"

VVV

"کیا آج یوں ہی بھگوتی رہو گی؟ کتنے سمندر چھپا رکھے ہیں، اپنے اندر؟"

اُسے خود سے الگ کرتے ہوئے اُس نے تمکین کا چہرہ دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں لے لیا۔

"یہ بھیگے بھیگے رخسار، نم پلکیں۔۔۔ تمو! تم تو دل و جان میں زبردستی گھسی جاتی ہو۔" وہ ہولے سے ہنسا تھا۔

"پتہ ہے، جب عقیل نے مجھے بتایا کہ جس زخمی لڑکی کو میں لایا ہوں، وہ شہزادی تمکین آرا عرف تمو ہیں، تب میں نے تمہارے رُوم میں جا کر تمہیں بہت غور سے دیکھا تھا۔ ہسپتال کے بیڈ پر آنکھیں موندے تم بے ہوش پڑی تھیں۔ تمہارے خون آلود چہرے کو صاف کر دیا گیا تھا۔ تمہاری سانولی رنگت زرد ہو رہی تھی اور تمہاری بند آنکھوں پر تمہاری لمبی مڑی ہوئی پلکیں۔ تم مجھے اُس تمو سے کتنی مختلف لگی تھیں، جسے میں نے آخری بار دیکھا تھا۔ تمہارے اندر کتنی نزاکت اور کوملتا پیدا ہو گئی تھی۔ جبکہ بچپن میں تو تم خوب صحت مند ہوتی تھیں۔ اور عقیل کبھی کبھی تمہیں موٹو کہہ کر بلاتا تھا تو آپی کتنا چڑتی تھیں۔۔۔ ہیں نا؟"

وہ اُس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لئے کھویا کھویا سا بول رہا تھا۔

"آپ اسے اتنا ٹھنسا ٹھنسا کر نہ کھلایا کریں۔ مستقبل میں کہیں نو من کی دھوبن ہی نہ بن جائے۔"

"کہاں ٹھنسا کر کھلاتی ہوں عقیل! یہ کھاتی کب ہے؟ اتنے نخرے کرتی ہے۔" وہ محبت سے تمہیں گود میں چھپا لیتی تھیں۔ "اور تم، میری تمو کو مت نظر لگایا کرو۔"

"اور عقیل تمہارے مستقبل کا کتنا خطرناک نقشہ کھینچتا تھا۔ تم روہانسی ہو جاتی تھیں۔ اور سچ پوچھو تو میرے ذہن میں جو کبھی تمہارا نقشہ بنتا تھا نا، تو ایسا ہی ایک موٹی تازی، صحت مند لڑکی کا۔ لیکن تمہیں دیکھ کر تو میں حیران ہی رہ گیا تھا اور میں نے بہت احمقوں کی طرح عقیل سے کہا تھا۔

"عقیل! تمو کی پلکیں تو بالکل ویسی ہیں، لانبی اور مڑی ہوئی۔"

اور عقیل ہولے سے ہنس دیا تھا۔

"تمہارا کیا خیال تھا، بڑے ہونے پر اس کی پلکیں جھڑ جائیں گی؟"

"اور۔۔۔ اور یہ موٹی بھی نہیں ہوئی، جیسا تم کہتے تھے۔ اور۔۔۔"

عقیل میرا ہاتھ تھام کر کمرے سے باہر لے آیا تھا۔

"شروع شروع میں تم سے مل کر مجھے ایسی ہی خوشی ہوئی تھی، جیسے صدیوں بعد اپنے بچپن کے کسی بچھڑے دوست سے مل کر ہوتی ہے۔ لیکن پھر میں بے قرار رہنے لگا۔ کیا تھا ایسا خاص تم میں۔ کیسی کشش تھی تم

میں؟۔۔۔ کتنی ملاحت تھی تمہاری رنگت میں۔ تمکین! میں تو تمہارا اسیر ہو گیا تھا۔ تمہاری طلب، تمہاری خواہش بار بار میرے اندر تڑپتی۔ تمہارے گھر بیٹھ کر آپی اور تم سے باتیں کرنا میری سب سے بڑی خوشی تھی۔ بابا جان کے بعد پہلی بار مجھے لگا، جیسے کسی ٹھنڈک اور کسی مہربان موسم نے آنچل پھیلا دیا ہو۔ جیسے دل پر مرہم لگ جائے۔ اتنی خاموشی اور اکتا دینے والی شاموں کے بعد دل ہنسنے اور بولنے کو چاہنے لگا تھا۔ آپا ناراض ہوتیں۔

"یہ تم ہر دوسرے روز ایبٹ آباد کیوں چل پڑتے ہو؟"

اُسے لگا جیسے اُس کا حلق خشک ہو رہا ہو۔ اُس نے اُس کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے سے آزاد کیا اور سائیڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس اُٹھا کر چند گھونٹ پیئے۔

"آپ تھک گئے ہوں گے، افروز! لیٹ جائیں۔ میں آپ کے پاس بیٹھتی ہوں۔"

"نہیں، میں تھکا نہیں ہوں۔"

"اچھا، تو پھر ٹیک لگا کر ایزی ہو کر بیٹھ جائیں۔"

"اوکے۔ جو حکم ملکہ عالیہ کا۔"

اُس نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھا اور بہت دیر تک یونہی دیکھتا رہا۔ تب تمکین نے گھبرا کر پوچھا۔

"آپ اتنا عرصہ پاکستان نہیں آئے۔ کیا آپ کا کبھی دل نہیں چاہا پاکستان آنے کا؟ کبھی اپنا گھر یاد نہیں آیا؟"

"تمکین!" اُس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں نے باباجان کے بعد یہ آٹھ سال جو وہاں گزارے ہیں، عجیب بے حسی کے عالم میں گزارے ہیں۔ میں سوچتا تھا، میرا کون ہے پاکستان میں۔ وہاں جا کر کیا کروں گا۔ بس ایک باباجان ہی تو تھے اور وہ۔۔۔۔ مجھے ماں کی گود کی گرمی یاد نہیں۔۔۔۔ نہ ہی مجھے ان کی شفقت کا، ان کی محبت کا پتہ ہے۔ میں نے تو ہوش سنبھالنے کے بعد صرف بابا کو ہی دیکھا تھا۔ شاید میں تین سال کا تھا، یا چار سال کا جب امی چھوٹے بھائی کی پیدائش پر وفات پا گئیں۔ چھوٹا بھائی بھی صرف دو دن زندہ رہا تھا۔ باباجان نے مجھے بتایا تھا کہ میری امی بہت خوب صورت تھیں۔ اتنی خوب صورت کہ نگاہیں جب ان پر پڑتی تھیں تو پھر جھپکنا بھول جاتی تھیں۔

میری امی، عقیل کے ابو کی رشتے دار تھیں۔ فرسٹ کزن۔ اور بابا نے پہلی بار انہیں تب دیکھا، جب ماموں (عقیل کے ابو) کے اصرار پر وہ ایبٹ آباد سیر کرنے آئے تھے۔ ماموں، بابا کے ساتھ ہی لاہور میں پڑھتے تھے اور بہت دوستی تھی اُن کی بابا سے۔ بابا واپس لاہور چلے گئے تھے۔ لیکن دل یہاں ہی چھوڑ گئے تھے۔ جب گھر میں انہوں نے اپنی خواہش کا ذکر کیا تو سخت مخالفت ہوئی۔ بابا نے گھر چھوڑ دیا اور کچھ عرصہ بالاکوٹ میں رہائش رکھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے گھر والے انہیں ایبٹ آباد میں آکر تلاش کر لیں۔ انہوں نے اپنے دوست یعنی ماموں کو بھی بالاکوٹ میں اپنی رہائش کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ پھر انہوں نے یہاں پھلکوٹ میں یہ بنگلہ خرید لیا۔ انہیں یہ علاقہ بہت پسند تھا۔ اور پھر میری امی بھی یہیں رہتی تھیں، اپنی نانی کے پاس۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ بابا نے ڈرائی فروٹ کا بزنس شروع کیا تھا اور ایک سال بعد انہوں نے ماموں جان

سے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور امی سے شادی کر لی۔ یہ ساری بات انہوں نے مجھے تب بتائی تھی، جب وہ مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایڈمیشن دلوانے لائے تھے۔ میں بہت مزے سے یہاں ایبٹ آباد میں پڑھ رہا تھا، جب ایف ایس سی کے بعد بابا نے کہا۔

"میری خواہش ہے کہ تم گورنمنٹ کالج لاہور سے بی ایس سی کرو۔ میں نے وہیں سے ہی بی ایس سی کیا تھا۔ ہم گورنمنٹ کالج کے اسٹوڈنٹ راوین کہلاتے تھے۔ ہمارے کالج کے میگزین کا نام بھی راوی تھا۔ اور میں اس کا ایڈیٹر ہوا کرتا تھا۔"

"لیکن بابا! آپ کو وہاں، اتنی دور جا کر پڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا تب یہاں ایبٹ آباد میں کالج نہیں تھا؟"

"میں تو لاہور میں ہی پیدا ہوا تھا۔" ان کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"اور پھر یہاں، اس چھوٹے سے پہاڑی قصبے میں کیسے آن بسے؟" میں حیرانی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

تب بابا نے پہلی بار وہ ساری بات مجھے بتائی تھی۔

"آپ کو امی سے بہت محبت تھی، بابا! اس لئے آپ نے ساری زندگی شادی نہیں کی۔ لیکن بابا! کیا آپ کو اپنے ماں باپ کبھی یاد نہیں آئے؟"

"آتے تھے۔" انہوں نے آہستگی سے کہا۔

"امی کے بعد کبھی آپ ان سے ملنے گئے تھے؟"

"گیا تھا۔"

"کیا اب وہ لوگ زندہ ہیں؟"

"نہیں۔۔۔" وہ خاموش ہو گئے تھے۔ میں نے بھی تب زیادہ کرید نہیں کی تھی۔ ایک تو مجھے زیادہ کریدنے کی عادت نہیں تھی۔ دوسرے میں لاہور میں رہ کر پڑھنے کے خیال سے پریشان ہو رہا تھا۔ ایک بالکل اجنبی جگہ، اجنبی لوگ۔ لیکن میں بابا کی خواہش رد کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شروع میں تو مجھے بہت گھبراہٹ ہوتی تھی۔ لیکن میرا روم میٹ اچھا تھا۔ افضل خان۔ وہ بھی کسی گائوں سے آیا تھا۔ یوں ہم دونوں کی دوستی ہو گئی اور دل بھی لگ گیا۔"

"تمو۔۔۔!" وہ یک دم چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ "تم تھک گئی ہو۔ نیند آ رہی ہے تمہیں۔ میں بھی تمہیں بور کر رہا ہوں۔ لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ میں تمہیں وہ سب کچھ بتائوں، جو میں نے کبھی کسی سے شیئر نہیں کیا۔"

"نہیں تو۔۔۔ مجھے بالکل بھی نیند نہیں آ رہی۔ اور میں بہت دھیان سے آپ کو سن رہی ہوں۔" تمکین نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا تو اس نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور بہت دیر تک یونہی ہاتھوں میں لیے رہا۔

"پتہ ہے، تمو! میرے بابا بہت محبت کرتے تھے مجھ سے۔ تب موبائل فون اتنا عام نہیں تھا۔ بلکہ تھا ہی نہیں۔ اور یہاں پھلکوٹ میں لینڈ لائن کی بھی سہولت نہیں تھی۔ بابا ہر تین دن بعد ایبٹ آباد آ کر

مجھے فون کرتے تھے اور مہینے میں دو بار مجھے لاہور ملنے آتے تھے۔ ایک بار وہ آئے تو مجھے کہنے لگے۔

"افروز! چلو، آج میں تمہیں کسی سے ملانے لے چلتا ہوں۔"

"کس سے؟" میں نے پوچھا تو وہ کچھ دیر یونہی سر جھکائے اضطراب سے اپنی انگلیاں چٹخاتے رہے۔ وہ اس وقت میرے کمرے میں تھے اور افضل خان کہیں باہر گیا ہوا تھا۔

"بابا! کیا آپ کچھ پریشان ہیں؟"

"افروز! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تم سے کیسے بات کروں؟"

"بابا۔۔۔!" میں اُٹھ کر اُن کے پاس آ بیٹھا تھا۔ "میں کوئی غیر تو نہیں، آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ اپنی ہر بات مجھ سے شیئر کر سکتے ہیں۔"

"مجھے تمہاری ناراضی سے ڈر لگتا ہے، افروز!"

"ارے بابا! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میں بھلا آپ سے کیوں ناراض ہوں گا؟ آپ کچھ غلط بھی کریں گے تو تب بھی میں آپ سے ناراض ہو ہی نہیں سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔"

بابا کچھ دیر یونہی سر جھکائے بیٹھے رہے، پھر ہولے سے بولے۔

"افروز! ایک بار تم نے پوچھا تھا کہ کیا مجھے اپنے ماں باپ یاد آئے تھے؟ تو افروز! وہ مجھے بہت یاد آتے تھے۔ انہوں نے مجھے زندگی کی ہر نعمت دی تھی۔ میں اُن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ذرا سا زکام بھی ہو جاتا تھا تو دونوں کی جان

پر بن آتی تھی۔اور میں نے انہیں چھوڑ دیا تھا۔ پتہ نہیں، میرے بغیر وہ کیسے رہتے ہوں گے۔۔۔۔پتہ نہیں۔۔۔۔تب تمہاری امی کی وفات کے دو سالوں بعد میں نے لاہور ایک دوست سے رابطہ کیا تو مجھے پتہ چلا کہ میری ماں بہت بیمار ہیں۔تب مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور میں بے قرار سا ہو کر لاہور آگیا۔میری اماں بہت بیمار تھیں۔"

"کتنے سنگ دل بن گئے تھے تم۔مڑ کر خبر ہی نہیں لی۔ ہمیں تم پر غصہ تھا لیکن تم نے تو دل ہی پتھر کر لیا تھا۔"

"اماں، ابا دونوں نے مجھے معاف کر دیا۔وہ چاہتے تھے کہ میں لاہور آجائوں تمہیں لے کر۔انہیں تمہاری ماں کی وفات کا بہت دکھ ہوا تھا۔لیکن میں یہ جگہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔یہاں میں نے تمہاری امی کے ساتھ زندگی کے اتنے خوش گوار دن گزارے تھے۔یہاں اس کی یادیں تھیں۔

میں نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں، آپ میرے ساتھ وہاں چل کر رہیں۔"

تب ابا نے کہا تھا۔"مستقل تو نہیں، لیکن کبھی کبھی تمہارے پاس آجایا کریں گے۔تم بھی آتے رہنا۔"

اماں کی طبیعت کافی خراب تھی۔

میں اکثر لاہور آجاتا۔ تمہیں تمہاری مامی کے پاس چھوڑ کر۔ایک دو بار تمہیں بھی ساتھ لے گیا تھا۔اماں ابا تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ پھر اماں کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔تب ابا نے مجھ سے کہا۔

"شاہ عالم! مہر بانو بیوہ ہو گئی ہے۔۔۔۔ایک بیٹی ہے اس کی۔تم اس سے شادی کر لو۔"

مہر بانو میری میری چچازاد بہن تھی اور میری منگیتر۔ چچی کی وفات کے بعد اماں نے اسے پالا تھا۔ان کی ناراضی کا زیادہ سبب بھی یہی تھا کہ میں نے مہر بانو کو ٹھکرا کر تمہاری امی سے شادی کر لی تھی۔ چچا ابھی تک مجھ سے بات نہیں کرتے تھے۔

"تمہارے بیٹے کو ماں کی ضرورت ہے۔اس وقت انکار مت کرو۔اسے میری آخری خواہش سمجھ لو۔"

اماں نے مرنے سے چند دن پہلے کہا تو میں نے سر جھکا لیا۔ میں نے پہلے ہی ان کو بہت دکھ دیا تھا۔اماں چند دن بعد وفات پا گئیں۔ میں نے مہر بانو سے شادی کر لی۔ لیکن میرے دل نے مہر بانو کو کبھی بھی قبول نہیں کیا۔

پھر بھی ابا کے اصرار پر میں، مہر بانو اور اس کی بیٹی شہر بانو کو پھلکوٹ لے آیا۔ لیکن ہفتہ بھر بعد ہی اس نے واپس جانے کی ضد شروع کر دی۔وہ یہاں کسی قیمت پر رہنے کو تیار نہ تھی اور نہ ہی وہ تمہیں رکھنے کو تیار تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بے شک افروز تمہارا بیٹا ہے اور ہمیشہ تمہارا بیٹا ہی رہے گا۔ لیکن اسے وہیں رہنے دو، اپنے ماموں مامی کے پاس۔ تم ایبٹ آباد میں ہی تھے اور میرا خیال تھا کہ دس بارہ دن بعد جب مہر بانو ایڈجسٹ ہو جائے گی تو تمہیں ایبٹ آباد سے ملانے لائوں گا۔ ظاہر ہے، پڑھائی کی خاطر تم نے رہنا تو ایبٹ آباد میں ہی تھا۔ لیکن مہر بانو کی تنگ نظری سے مجھے دکھ پہنچا۔ میں نے بھی تو اس کی بیٹی کے لئے دل کشادہ کر لیا تھا۔ لیکن وہ

تمہارے لئے دل کشادہ نہ کر سکی۔ سو میں اسے واپس لاہور لے آیا۔ ابا اور چچا نے بھی اسے بہت سمجھایا لیکن بچپن سے ہی اس میں بہت حاکمیت تھی۔

بہر حال، ابا اور چچا کی خاطر میں نے اس کی بات مان لی۔ مہینے میں دو یا تین بار میں لاہور آتا تھا۔ میں نے ہمیشہ اس کی اور شہر بانو کی ساری ذمے داریاں سنبھالیں۔ ابا خوش تھے اور کبھی کبھی مجھ سے معذرت کرتے تھے کہ انہوں نے مہر بانو کے ساتھ میری شادی کر کے زیادتی کی ہے۔ پھر پہلے چچا اور پھر ابا بھی وفات پا گئے۔ اب یہاں مہر بانو رہتی ہے اور شہر بانو۔ میں نے شہر بانو کو ہمیشہ بیٹی کی طرح ہی سمجھا بلکہ وہ میری بیٹی ہی ہے۔ مہر بانو بھی اب بدل گئی ہے، عمر کے ساتھ۔ اب اُسے بیٹے کی کمی محسوس ہوتی ہے تو بہت پچھتاتی ہے۔"

"تمکین!۔۔۔ میں نے بابا کی پوری بات سنی تھی۔ نہ مجھے ان پر غصہ آیا تھا، نہ ناراض ہوا تھا۔ بلکہ مجھے ان پر فخر ہوا تھا۔"

"پتہ نہیں، تم یہ سب سن کر کتنا خفا ہو گے مجھ سے۔" بابا افسردگی سے مسکرائے تھے۔ "میں نے اس لئے کبھی تم سے ذکر نہیں کیا کہ تم ڈسٹرب ہو گے۔"

"نہیں بابا! میں بالکل بھی خفا نہیں ہوں آپ سے۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ اپنے ابا اور اماں کی بات مان لی۔ والدین کا بھی تو حق ہوتا ہے نا۔ چلیں، یہ بتائیں مجھے کب لے چلیں گے اماں اور آپا سے ملانے؟"

"ابھی۔۔۔ ابھی چلو بیٹا!" بابا خوش ہو گئے تھے۔ "اگلے ہفتے شہر بانو کی شادی ہے اور شہر بانو اور مہر بانو دونوں ہی، جب بھی جاتا ہوں، اصرار کرتی ہیں کہ تم اس شادی میں ضرور شریک ہو۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں تم۔۔۔"

"آپ بھی بابا! اپنے بیٹے کو نہیں جانتے۔ میرے لئے وہ آپ کے حوالے سے بہت قابل احترام ہیں۔ اگر آپ نے ان سے شادی نہ بھی کی ہوتی تو وہ آپ کی کزن تھیں۔ میرا واحد ددھیالی رشتہ۔"

تمکین اُسے بولتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ سن رہی تھی۔ کیا ایک روز ایسا آئے گا کہ یہ خوب صورت آواز، ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے گی؟۔۔۔ میرے کان اس مدھم، دلکش آواز کو نہیں سن سکیں گے؟

"تمکین۔۔۔!"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کر دیا۔

"اماں اور آپا مجھ سے اچھی طرح ملی تھیں، بلکہ انہوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اپنے آبائی گھر کو دیکھنا مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ وہ بہت بڑا اور خوب صورت گھر ہمارے اس چھوٹے سے بنگلے کے مقابلے میں ایک محل لگا تھا مجھے۔ میں تمہیں دکھاؤں گا تمکین!۔۔۔ وہاں کرائے دار ہیں۔ بابا نے اسے فروخت نہیں کیا۔ وہ آدھا گھر اماں کا اور آدھا بابا کا تھا۔ اماں اور آپا چاہتی تھیں کہ میں ہاسٹل کے بجائے ان کے پاس رہوں، لیکن بابا نے منع کر دیا کہ نہیں، اس کی پڑھائی کا حرج ہو گا۔ البتہ میں نے وعدہ کیا کہ میں ویک اینڈ پر آ جایا کروں گا۔

آپا کی شادی ہوئی، لیکن آپا شادی کے بعد بھی اسی گھر میں تھیں۔ان کے میاں بھی وہیں آگئے تھے۔شاید ان کا اپنا گھر نہیں تھا۔یا پھر اماں نے پہلے سے ہی ان سے طے کر لیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ رہیں گے۔میں نے پوچھا نہیں۔پتہ ہے، تمو! میں بہر حال اس نئے تعلق پر خوش تھا اور میں اکثر بابا سے کہتا تھا کہ یا تو وہ بھی یہاں آ جائیں یا پھر اماں کو ساتھ لے جائیں۔آپا اور ان کے شوہر یہاں رہیں مزے سے۔لیکن ابا ہنس کر ٹال جاتے۔

''یار! تمہاری اماں اس چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں نہیں رہ سکتی۔ایک دن بھی نہیں۔بہت سوشل ہے وہ۔ وہاں نہ پارٹیاں، نہ گیدرنگ، نہ کلب، نہ کسی این جی او کی اعزازی ممبر شپ۔۔۔۔پتہ ہے بابا۔۔۔۔''

''میں تمہیں بور کر رہا ہوں نا؟'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر پوچھا۔

''نہیں۔۔۔۔بالکل بھی نہیں۔'' تمکین مسکرائی۔

''بابا کا تو تمہیں پتہ ہے نا، تمکین! وہ اچانک ہی فیصلہ کرتے تھے۔اب کی بار بھی انہوں نے اچانک ہی فیصلہ سنایا تھا۔

''افروز! میں تمہیں امریکہ بھیج رہا ہوں۔۔۔۔باقی کی تعلیم وہاں ہی حاصل کرنا۔میں نے افضل خان سے بات کر لی ہے۔وہ تمہیں اسپانسر کرے گا۔آج کل بوسٹن میں ہے۔''

''لیکن بابا! میرا خیال ہے کہ میں ماسٹرز یہاں پنجاب یونیورسٹی سے ہی کر لوں۔میں نے ڈبل میتھس اور فزکس کے ساتھ بی ایس سی کیا تھا اور میرا ارادہ فزکس میں ہی ایم ایس سی کرنے کا تھا۔بعد میں ایم فل اور پی ایچ ڈی باہر سے کر لوں گا۔امریکہ یا انگلینڈ۔۔۔۔''

''پہلے میرا بھی یہی خیال تھا۔لیکن اب میں بہتر سمجھتا ہوں، تم جتنی جلدی ممکن ہو، باہر چلے جاؤ۔''

میں نے بابا سے کبھی بحث نہیں کی تھی، سو اب بھی بحث نہیں کی تھی۔بابا نے ان دنوں اپنی ساری پراپرٹی کی تفصیل مجھے بتائی تھی۔مشترکہ اکاؤنٹ کھلوائے تھے۔

''میں چاہتا ہوں کہ اگر کبھی میں نہ رہوں تو تمہیں پرابلم نہ ہو۔''

''بابا، پلیز! ایسی باتیں کریں گے تو میں نہیں جاؤں گا۔''

''پاگل! یہ تو زندگی کی حقیقت ہے اور موت اپنے وقت پر ہی آئے گی۔''

پھر انہوں نے میرے حصے کی ساری پراپرٹی میرے نام کر دی۔میں نہیں جانتا تھا، تمو! میں بالکل بھی نہیں جانتا تھا کہ اپنے جانے کے صرف دو سال بعد میں اپنے بابا کو کھو دوں گا۔میں جب ایئرپورٹ پر کھڑا تھا اور جب میں انہیں خدا حافظ کہہ رہا تھا، اُن کے گلے لگ رہا تھا تو یہ سب آخری بار تھا۔پھر اس کے بعد نہیں۔وہ کتنی دیر تک مجھے اپنے بازوؤں میں بھینچے کھڑے رہے۔انہوں نے میری پیشانی چومی تھی اور میرے ہاتھوں پر بوسہ دیا تھا اور پھر جیسے اُن کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔اُن کے آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر رخساروں پر آ گرے تھے۔''

''بابا! میں نہیں جاؤں گا۔مجھے نہیں جانا۔'' میں مچلا تھا۔

''پگلے! یہ تو فطری ہے۔جدائیاں چاہے لمبی ہوں، چاہے مختصر۔جدائیاں ہی ہوتی ہیں میری جان!''

"اماں اور آپا کو لے آیئے گا۔ اکیلے مت رہیئے گا۔ یا پھر لاہور چلے جایئے گا۔" میں نے تاکید کی تھی۔

اور پھر میں نے آخری بار انہیں دیکھا، ہاتھ ملایا اور۔۔۔۔

"تمکین! وہاں بھی بابا کا وہی معمول رہا۔ ہر ہفتے فون کرنا، دل لگا کر پڑھنے کی تلقین کرنا اور بہت ساری دعائیں دینا۔ بابا نے مجھے بتایا تھا، اماں اور آپا پھلکوٹ میں آگئی ہیں۔ اور لاہور والا گھر کرائے پر دے دیا ہے۔ وہ چاہتی تھیں کہ بابا، آپا کے میاں نادر بھائی کو اپنے کاروبار میں شامل کر لیں۔ باباجان کا ڈرائی فروٹس کا کاروبار تھا۔ وہ سندھ اور پنجاب میں ڈرائی فروٹس سپلائی کرتے تھے۔ اور بابا نے نادر بھائی کو اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ میں مطمئن ہو گیا تھا کہ بابا اکیلے نہیں ہیں۔ آپا، اماں اور نادر بھائی ساتھ ہیں۔ لیکن پھر کچھ ہی عرصے بعد مجھے لگنے لگا، بابا پریشان ہیں۔ وہ ہر بار فون کرنے پر مجھ سے پوچھتے کہ میرا سمیسٹر کب ختم ہو رہا ہے۔

"کیا بات ہے، بابا! آپ کچھ پریشان ہیں؟"

"نہیں تو۔۔۔" وہ ٹال دیتے۔ "یوں ہی، تمہارے لئے دل اُداس ہو رہا ہے۔ سمیسٹر کمپلیٹ کر کے دس پندرہ دن کے لئے آجاؤ۔"

"ٹھیک ہے، بابا!"

"میں تو خود بہت اُداس ہو رہا تھا۔ لیکن تمو! بابا نے اتنی جلدی کی جانے کی کہ میرا انتظار بھی نہیں کیا۔ ابھی میرا سمیسٹر ختم نہیں ہوا تھا کہ عقیل کا فون آگیا۔ وہ رو رہا تھا۔

"افروز! بابا چلے گئے ہیں۔"

"کیسے؟۔۔۔ کیا ہوا؟۔۔۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے تو مجھ سے بات ہوئی تھی۔"

"پتہ نہیں افروز! ہمیں تو خود بھی پتہ نہیں ہے۔ صبح ہی شیر زمان نے باباجان کو بتایا کہ وہ تقریباً پندرہ دن سے بیمار تھے۔ لیکن ایک ہفتے سے ان کی طبیعت زیادہ خراب تھی۔ کل صبح انہیں ہسپتال لایا گیا اور آج۔۔۔"

میں پتہ نہیں، کیسے یہاں پہنچا تھا۔ لیکن بابا منوں مٹی تلے دفن ہو چکے تھے۔ میں کیا کرتا یہاں رہ کر؟۔۔۔ میرا کون تھا؟ مجھے لگتا تھا، جیسے یہاں اس گھر میں، جہاں بابا نہیں ہیں، میرا دم گھٹ جائے گا۔ سو میں چلا گیا اور اب بھی آنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے عقیل اور ماموں جان کو صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے نہیں آنا پاکستان۔ میرا جو کچھ بھی ہے، ڈونیٹ کر دیں کسی ادارے کو۔ لیکن پھر میں آگیا۔" اُس نے مسکرا کر تمکین کی طرف دیکھا۔

"شاید مجھے تم سے ملنا تھا، تمکین!۔۔۔ یہ تین ماہ میری زندگی کے سب سے خوب صورت اور حسین دن ہیں۔ جب تم چھوٹی سی تھیں نا، تو میرے ذہن میں گمان تک نہیں تھا کہ جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو میرے لئے اتنی اہم ہو جاؤ گی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اتنا مختصر ساتھ ہو گا ہمارا۔۔۔ میں بہت پہلے آجاتا۔" اس نے حسرت سے تمکین کی طرف دیکھا۔

"کوئی مختصر ساتھ نہیں ہے ہمارا۔ ہم نے ابھی بہت سارے سال اکٹھے رہنا ہے۔" تمکین نے بڑے یقین سے کہا تو وہ یوں مسکرایا، جیسے اس نے کوئی بے وقوفانہ بات کی ہو۔

"دو بج گئے ہیں۔" تمکین نے سامنے کلاک پر نظر ڈالی۔ "اور ہمیں صبح جانا بھی ہے۔ آپ تھک جائیں گے۔ پلیز، کچھ دیر آرام کر لیں۔"

"تم بہت ظالم ہو، تمکین!" اس نے تکیہ سیدھا کیا اور لیٹ گیا۔ "کچھ فائدہ نہیں ہے، میں جانتا ہوں۔" اُس نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا اور آنکھیں موند لیں۔

کچھ فائدہ ہو یا نہ۔ لیکن تمکین ہتھیار نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی آخری حد تک کوشش کرنا چاہتی تھی۔ کیا پتہ، کوئی معجزہ ہو جائے۔ کیا خبر، اللہ اس کی دعائیں سن لے۔۔۔ اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے وہ اُس کی صحت و زندگی کے لئے بے آواز دعا کرنے لگی۔

VVV

صبح تمکین کی آنکھ حسبِ معمول نماز کے وقت کھل گئی تھی۔

اُس نے افروز کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک اسے یونہی دیکھتی رہی۔ لمبی مڑی ہوئی پلکوں نے اس کے زرد رخساروں پر سایہ کر رکھا تھا۔ جب پہلی بار اس نے ہسپتال کے کمرے میں افروز کو دیکھا تھا اور عقیل نے کہا تھا۔

"تمو! پہچانا اسے، کون ہے یہ؟"

اور اپنی طرف دلچسپی اور اپنائیت سے دیکھتے ہوئے افروز خان کی رنگت میں اتنی زردی تو نہ تھی۔ بلکہ اُس کی سفید رنگت میں ہلکا ہلکا گلابی پن تھا۔ یہ زردیاں تو اب اس کی رنگت میں گھلتی جا رہی تھیں۔

وہ افروز خان کی رفاقت کا سن کر بہت خوش ہوئی تھی۔

آپی اُسے افروز کے پرپوزل کا بتا کر بہت دیر تک دیکھتی رہی تھیں۔

"پتہ نہیں، تمو! میں نے صحیح کیا ہے یا غلط۔ لیکن اور کتنا انتظار کروں؟ سعادت انکل نے تو پھر خبر تک نہیں لی۔ اور ان کے صاحبزادے، جنہیں ہم نے دیکھا تک نہیں، نہ کوئی تصویر، نہ کوئی اتا پتہ اور سچ تو یہ ہے کہ ہمیں تو ان کا نام تک معلوم نہیں۔ ابی جان نے جب بھی نام لیا، شہزادہ ہی لیا۔ اور اب پتہ نہیں، شہزادہ ان کا حقیقی نام ہے یا پیار کا۔ لیکن اگر یہ حقیقی نام بھی ہو تو صرف ایک نام سے ہم کراچی جیسے بڑے شہر میں انہیں کہاں ڈھونڈیں گے؟ تم میرے اس فیصلے سے ناراض تو نہیں ہو، تمو؟"

"نہیں۔۔۔۔"

اس کا سر نفی میں ہلا تھا۔اندر کہیں جلترنگ بج رہے تھے۔افروز خان تو بچپن میں بھی اس کے پسندیدہ تھے اوراب صرف ایک ماہ کی ملاقات میں بہت اپنے اپنے لگنے لگے تھے۔

''افروز اپنی آپا اور اماں کو لانے سے پہلے تم سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔وہ جو بھی کہے گڑیا! یہ ذہن میں رکھنا کہ ہمارے پاس اور کوئی چوائس نہیں ہے۔اور شہزادے کا انتظار فضول ہے۔''

تب افروز نے اُس سے کہا تھا۔

''تمکین! میں بہت لمبی چوڑی بات نہیں کروں گا۔شادی زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے۔دو افراد کا ایک پُرخلوص بندھن،ایک گھر کی بنیاد ڈالی جاتی ہے۔پھر ایک گھر بنتا ہے۔میں چاہتا ہوں کہ اس گھر کی بنیاد میں کہیں کوئی اُلجھن، کھوٹ یا جھوٹ نہ ہو۔بچپن سے لے کر بیس سال کی عمر تک کی زندگی،آپ کے سامنے ہے۔تمہیں بھی کچھ نہ کچھ تو یاد ہوگا۔دو سال لاہور اور آٹھ سال انگلینڈ اور امریکہ کے۔یہ تم سے پوشیدہ ہیں۔میں چاہتا ہوں کہ تمہیں بتائوں،جوان آٹھ سالوں میں تبدیلی آئی ہے۔میں بالکل ویسا ہی ہوں۔اپنی سوچ،اپنے کردار اور اپنے لائف اسٹائل میں۔

ہاں،میری زندگی میں آج سے چھ سال پہلے ایک تبدیلی آئی تھی،تب میں انگلینڈ میں تھا۔وہ واقعہ ایک اتفاق تھا۔وہ لڑکی میرے سامنے فلیٹ میں رہتی تھی۔آتے جاتے کبھی کبھار سیڑھیوں پر،نیچے پارکنگ میں یا لابی میں اس سے ہیلو ہائے ہو جاتی تھی۔جس روز اُسے پولیس پکڑ کر لے گئی تھی اور میں اُس کی درخواست پر اُس کی ضمانت کے لئے گیا تھا تو مجھے اُس کا نام تک نہیں معلوم تھا۔لیکن پولیس کو اُس نے میرا نام بتایا تھا۔وہ محض

انسانی ہمدردی تھی۔میں نہیں جانتا تھا کہ اس ملک میں اس طرح کی ہمدردی مہنگی پڑ سکتی ہے۔کوپ نے جو ایک لیڈی تھیں،جب میں اُسے اپنی گاڑی میں وہاں سے لا رہا تھا،ہنستے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔

''تم اپنی گرل فرینڈ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے جبکہ یہ مہینے میں دو بار یہاں ہوتی ہے۔کبھی نشے کے الزام میں،کبھی۔۔۔۔''

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ نشہ کرتی ہے۔لیکن اس روز کے بعد میں نے ایک بار اسے سیڑھیوں کے پاس نیم بے ہوش دیکھا اور سہارا دے کر اس کے فلیٹ میں لایا۔پھر اس روز کے بعد کبھی کبھی ہم میں دعا سلام ہو جاتی تھی۔وہ میری ممنون نظر آتی تھی۔اکثر میری روٹین پر حیرت کا اظہار کرتی تھی۔بہت لمبی بات نہیں کروں گا،تم سے۔۔۔۔وہاں ایسی سینکڑوں بلکہ ہزاروں کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔وہ بھی ان سینکڑوں ہزاروں لڑکیوں کی طرح تھی،جس نے ماں باپ کی علیحدگی کے بعد اِدھر اُدھر،مختلف گھروں میں پرورش پائی تھی۔اُس کے دل میں ایک گھر کی بڑی حسرت تھی۔وہ چاہتی تھی کہ میں اس سے شادی کرلوں،اسے ایک گھر دوں۔میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا تمکین! نہ میں نے ایسا کبھی سوچا تھا،نہ کبھی میں نے غور سے اُسے دیکھا تھا۔لیکن جب وہ میرے سامنے بیٹھی اپنی نیلی آنکھوں میں سمندر لئے ملتجی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی تو مجھے لگا تھا،میں ان نیلی آنکھوں کے سمندر میں ڈوب گیا ہوں۔میں اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔میں اس سے شادی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔اس کے کلچر،

مذہب اور میرے مذہب اور کلچر میں بہت فرق تھا۔لیکن جب اس نے روتے ہوئے دوبارہ مجھ سے کہا۔

"افروز! پلیز مجھ سے شادی کرلو۔ میں بہت سارے دن تمہیں تنگ نہیں کروں گی۔ میں جانتی ہوں، میں تمہارے قابل نہیں ہوں، کسی طرح سے بھی۔"

اور میں اُس کی التجا کو ٹھکرا نہ سکا۔ مجھے کہیں نہ کہیں تو شادی کرنی ہی تھی۔ پھر اس لڑکی سے کر کے ایک زندگی سنوارنے کی کوشش کیوں نہ کروں۔ یوں بھی باباجان کے بعد میں بہت تنہا تھا۔۔۔۔ بہت اکیلا تھا۔ اس وقت میں نے صرف اُس کی شادی کی التجا سنی تھی، باقی جملوں پر غور نہیں کیا تھا۔ لیکن جب چار ماہ بعد وہ چلی گئی، تب میں نے جانا کہ وہ کیوں کہہ رہی تھی کہ وہ مجھے بہت زیادہ دن تنگ نہیں کرے گی۔"

"کیا ہوا اُسے؟ وہ کہاں چلی گئی تھی؟" تمکین نے بے قراری سے پوچھا۔

"پتہ نہیں، تمکین!" وہ افسردگی سے مسکرایا تھا۔ "ایک دن میں واپس آیا تو وہ نہیں تھی۔ وارڈروب خالی تھا اور ٹیلی فون کے نیچے اس کا خط پڑا تھا۔ اُس نے لکھا تھا۔

"میں نے تم سے کہا تھا افروز! کہ میں تمہیں زیادہ تنگ نہیں کروں گی۔ سو آج اپنا وعدہ پورا کر رہی ہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔۔۔۔ بہت اچھے ہو۔ لیکن میں بہت بری ہوں۔۔۔۔ گندی نالی کی باسی۔۔۔۔ تم جانتے ہو، میں نے تم سے شادی کی درخواست کیوں کی تھی؟ مجھے بچہ چاہئے تھا۔۔۔۔ میں بچہ پالنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے میں نے دو بار بچوں کو جنم دیا لیکن دونوں بار سوشل سکیورٹی والے لے گئے۔ وہ کہتے تھے، میں ایک نشہ باز سنگل ویمن ہوں اور میرا کوئی مستقل ذریعہ آمدنی بھی نہیں ہے، اس لئے مجھے بچہ رکھنے کا کوئی حق نہیں۔ تم سے شادی کے بعد میں سنگل ویمن نہیں رہی اور۔۔۔۔ ایک بار پھر میں ماں بننے والی ہوں۔ اب مجھ سے میرا

بچہ کوئی نہیں چھین سکے گا۔ اپنی شادی کے کاغذات ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔ مجھے تلاش مت کرنا۔ میرا تمہارا ساتھ اتنا ہی تھا۔ میں نے صرف اسی مقصد کے لئے تم سے شادی کی تھی۔ تم بہت اچھے ہو۔ بہت بلند۔۔۔۔ بہت اعلیٰ ظرف۔ مجھ جیسی لڑکی، جو کبھی Prostitute بھی رہی ہو، تمہاری رفاقت کے قابل نہیں۔ مجھے میری اس بد دیانتی پر معاف کر دینا۔ میرا بچہ بالکل تمہارے جیسا ہوگا۔ تمہارے جیسا اچھا۔"

اُس نے ایک گہری سانس لی تھی۔

"تمکین! میں نے اسے بہت ڈھونڈا، بہت تلاشا، ڈیٹکٹیو کی مدد بھی لی لیکن وہ جانے کہاں چھپ گئی تھی۔ میں نہیں جانتا، وہ بچہ دنیا میں آیا بھی یا نہیں۔ اگر آیا تھا تو اس کے پاس تھا یا چھین لیا گیا تھا۔ میں اس بچے کے لئے، جو میرا تھا، ساری عمر اس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے تین سال اس کی تلاش میں جگہ جگہ کی خاک چھانی۔ آج بھی باقاعدگی سے میں ایک سراغ رساں کمپنی کو رقم ادا کرتا ہوں، اس کی تلاش کے لئے۔۔۔۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو مل جاتی۔ شاید وہ زندہ ہی نہیں ہے۔ بس یہی ہے میری زندگی کی کہانی۔ تم کچھ پوچھنا چاہو تو پوچھ لو۔"

لیکن تمکین کو کچھ نہیں پوچھنا تھا۔ بات صرف یہ نہیں تھی کہ بقول آپی اُن کے پاس اور کوئی چوائس نہیں تھی۔ بات یہ بھی تھی کہ تمکین آرا کو افروز خان بھا گئے تھے اور انہوں نے بڑی خاموشی سے اس کے دل میں اپنی مسند سنبھال لی تھی۔

VVV

افروز نے کروٹ بدلی تو تمکین چونک کر بیڈ سے اُتر آئی۔

جب وہ نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو بھی افروز سو رہا تھا۔ اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ باہر پہاڑوں کو ہلکی ہلکی دُھند نے گھیر رکھا تھا۔ سرمئی سا منظر جیسے کسی نے پینٹ کر دیا تھا۔

وہ کچھ دیر یونہی باہر دیکھتی رہی اور پھر دھیمے دھیمے چلتے ہوئے افروز کے بیڈ تک آئی۔ کچھ دیر یونہی اُسے دیکھتی رہی اور پھر دبے قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل آئی۔ کچن میں آپا چائے بنا رہی تھیں۔ وہ شرمندہ سی ہوئی۔

''آپا! ہٹیں، میں چائے بناتی ہوں۔''

شہر بانو خاموشی سے پیچھے ہٹ گئیں اور باہر جاتے ہوئے انہوں نے بغور اُس کے ستے ہوئے چہرے اور سوجے ہوئے پپوٹوں کو دیکھا۔

''میں نے سوچا، جانے رات کتنی دیر سے سوئی ہو گی تو دیر سے اُٹھو گی۔''

''نہیں آپا! میں تو جلدی اُٹھ گئی تھی۔ نماز پڑھ کر یونہی باہر دیکھتی رہی۔ سامنے پہاڑی پر بنا ڈاک بنگلہ سرمئی بادلوں اور دُھند میں لپٹا کوئی خواب کا سا منظر لگتا ہے۔۔۔۔ بہت اچھا لگتا ہے اُسے دیکھنا۔۔۔۔ ویران ہے کیا؟'' اُس نے ساس پین کا ڈھکن اُٹھا کر دیکھا۔ ابھی پانی بوائل نہیں ہوا تھا۔

''جولائی، اگست میں کچھ سیاح آتے ہیں اِدھر، سر پھرے۔ ورنہ زیادہ تر بالا کوٹ کی طرف جاتے ہیں۔ آگے کاغان، ناران وغیرہ۔ یہ سال کے نو مہینے تو خالی ہی رہتا ہے۔ ظفر علی خان ادھر ایبٹ آباد میں رہتے ہیں۔ ان کا ہے یہ ریسٹ ہاؤس۔'' شہر بانو کو لمبی بات کرنے کی عادت تھی۔

''میں نے سمجھا، پی ٹی ڈی سی والوں کا ہو گا۔''

''ارے نہیں، اُنہیں کیا ضرورت پڑی ہے یہاں، اس چھوٹے سے گاؤں میں ریسٹ ہاؤس بنانے کی۔'' وہ طنزیہ سی ہنسی ہنستے ہوئے نکل گئیں۔

کچھ دیر بعد تمکین چائے بنا کر باہر لے آئی۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ انہیں بیڈ ٹی کی عادت تھی اور تقریباً دو ماہ پہلے تمکین، افروز کے لئے کافی بنانے کچن میں آئی تھی تو شہر بانو، کچن میں اپنے لئے

چائے بنا رہی تھیں۔

''افروز بھی جاگ رہا ہے کیا؟'' چائے دانی سے ٹی کوزی ہٹاتے ہوئے شہر بانو نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا، جو واپس کمرے میں جانے کے لئے لاؤنج سے باہر نکل رہی تھی۔

"اُسے سمجھایا کرو تمکین! کہ صبح اٹھ کر نماز پڑھا کرے۔"

"پڑھتے ہیں آپا! بس کبھی کبھی۔"

"کبھی کبھی۔" وہ عجب طرح سے مسکرائیں۔ "تمکین بی بی! جانتی ہو کہ قبر میں پہلی پرسش نماز کے متعلق ہی ہو گی۔ جو وقت بچا ہے، معافی تلافی کر لے۔"

تمکین کے پورے وجود میں کچھ دیر کو کپکپی سی پیدا ہوئی۔ کوئی گہرا درد اندر دُور تک وجود کو چھیلتا چلا گیا تھا۔

"خیر، کہاں جا رہی ہو؟" وہ اب قہوہ پیالی میں ڈال رہی تھیں۔

"دیکھوں کہ افروز جاگے ہیں یا نہیں۔" وہ اب وہاں کھڑا نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اُسے شہر بانو کی باتوں سے خوف آتا تھا۔ ان کی حقیقت بیان کرتی باتیں اسے زخمی کرتی چلی جاتی تھیں۔

"عقیل کب آ رہا ہے؟"

"نو بجے تک آ جائیں گے۔" تمکین نے ان کی طرف دیکھا۔

"تو پھر ناشتہ تیار کر لو پہلے۔ آج دلبر اور اس کی ماں تو نہیں آئے گی۔ کل بتا گئے تھے۔"

"جی اچھا۔"

دلبر اور اس کی ماں یہاں بنگلے میں کام کرتے تھے اور اس کے آنے سے پہلے تک تو کوکنگ بھی دلبر کی ماں ہی کرتی تھی۔ دلبر دس گیارہ سال کا لڑکا تھا، جو باہر سے سودا وغیرہ لاتا تھا۔

"ویسے فائدہ کوئی نہیں اتنی دور جانے کا۔ پہلے کبھی کوئی اس موذی مرض سے بچا ہے، جواب کوئی معجزہ ہو جائے گا؟ اور معجزے تو پیغمبروں کے ساتھ ہوتے ہیں بھئی۔ ہم بے چارے لوگوں کے ساتھ نہیں۔"

'پتہ نہیں، یہ شہر بانو آپا اتنی سنگ دل کیوں ہیں۔' اندر کہیں ایک آنسو گرا تھا اور لب ذرا سے کانپے تھے۔ اس نے گھونٹ گھونٹ چائے پیتی شہر بانو کو دیکھا۔

'اور افروز کہتا ہے کہ آپا کو مجھ سے بہت محبت ہے۔ اور کیا کوئی اس طرح کی بات کر سکتا ہے؟ میں تو ایسا سوچنا بھی نہیں چاہتی کہ۔۔۔۔'

"خیر، تم بھی لے جا کر شوق پورا کر لو۔ حالانکہ خوامخواہ کا تھکنا ہے۔ اپنے گھر، اپنے بستر پر سکون سے مرنا اچھا ہے یا ہسپتال کے بیڈ پر ڈاکٹروں کی بے رحمی کا شکار ہو کر۔"

تمکین کے لئے اب مزید وہاں کھڑا رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے مڑی اور کچن میں آ کر دیوار سے ٹیک لگا کر رونے لگی۔

'نہیں۔۔۔۔ افروز نہیں مرے گا۔ وہ نہیں مر سکتا۔ ہم نے ابھی زندگی میں دیکھا ہی کیا ہے۔ شادی شدہ زندگی کے صرف چار ماہ۔ اور ان میں بھی دو ماہ سے مسلسل پریشانی۔۔۔۔'

کچھ دیر یونہی رونے کے بعد اس نے اپنا چہرہ پونچھا اور چولہا جلانے لگی۔ ابھی اس نے پراٹھوں کے لئے آٹا نکالا ہی تھا کہ عقیل آ گیا۔

"عقیل بھائی!" اُسے دیکھ کر آنکھیں پھر آنسوئوں سے بھر گئیں۔

"نو۔۔۔بی بریو۔" عقیل نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

"افروز تیار ہے؟" وہ پوچھ رہا تھا اور شہر بانو لائونج کے دروازے پر کھڑی انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"آپ چلیں بیٹھیں۔ میں افروز کو جگاتی ہوں۔اور جب تک افروز تیار ہوتے ہیں،آپ ناشتہ کر لیں۔ بہت سویرے نکلے ہوں گے۔"

"ہاں، لیکن ناشتہ میں نے کر لیا تھا۔بس، چائے لوں گا۔" وہ شہر بانو کو سلام کر کے لائونج کی طرف بڑھ گیا۔

وہ اپنے کمرے میں آئی تو افروز بیڈ کرائون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

"آپ جاگ گئے افروز! وہ عقیل بھائی۔۔۔۔"

"ہاں، میں نے اُس کی جیپ کی آواز سنی تھی۔" افروز بے حد نقاہت محسوس کر رہا تھا۔پہلے سے کچھ زیادہ ہی۔ شاید رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے۔اس نے سوچا لیکن وہ ہمت کر کے اُٹھا۔

"میں تیار ہو کر آتا ہوں۔"

تمکین نے بنا کچھ کہے اُس کے کپڑے نکال کر رکھے اور خود باہر چلی آئی۔اور جب وہ ناشتہ لگا رہی تھی، تب افروز بھی آگیا۔لِونگ رُوم کے طور پر استعمال ہونے والے اس لائونج میں ہی ایک طرف ڈائننگ ٹیبل لگی ہوئی تھی۔

"اماں جان شاید جاگ گئی ہوں، تمکین! پوچھو ذرا، وہ ناشتہ کمرے میں کریں گی یا یہاں؟ یا پھر رہنے دو، میں جاتی ہوں۔" عقیل سے باتیں کرتے کرتے شہر بانو نے اُس کی طرف دیکھا۔

"نہیں آپا! آپ آئیں، ناشتہ شروع کریں۔ میں اماں جان کو ناشتہ دیتی ہوں۔"

"وہ، دراصل آج دلبر اور اس کی ماں نہیں آئی تو اس لئے۔۔۔۔" وہ افروز کو بتا رہی تھیں۔ تمکین نے جاتے جاتے سنا۔اور جب وہ اماں جان کو ناشتہ دے کر لِونگ رُوم میں آئی تو عقیل، افروز اور شہر بانو

ناشتے کی ٹیبل پر تھے۔

"آجائو تمکین! تم بھی۔" افروز نے اُس کی طرف دیکھا۔ تمکین، شہر بانو کے ساتھ والی چیئر پر بیٹھ گئی تھی۔ افروز نے اپنی پلیٹ میں ایک سلائس رکھا ہوا تھا، جسے وہ چائے کے ساتھ ذرا ذرا سا توڑ کر کھا رہا تھا۔

"افروز! آپ نے جوس نہیں لیا۔اور آپ نے بھی عقیل بھائی!"

"نہیں پلیز۔ میرے لئے مت ڈالنا۔" عقیل نے ہاتھ اٹھا کر منع کیا۔"میں نے بتایا تھا، صرف چائے لوں گا۔"

افروز نے بھی منع کر دیا تھا۔خود اس کا دل بھی کچھ لینے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن افروز بہت گہری نظر سے اسے دیکھ رہا تھا اور محض اس کی خاطر اس نے ایک سلائس اپنی پلیٹ میں رکھا اور اپنے لئے چائے بنانے لگی۔ شہر بانو بہت رغبت سے پراٹھا اور آملیٹ کھا رہی تھیں۔

"ہاں تو عقیل! میں تمہیں بتا رہی تھی کہ وہ لڑکا صرف اٹھارہ سال کا تھا۔ لاہور میں ہمارے گھر کے ساتھ گھر تھا اُس کا۔ بے چارے کو بلڈ کینسر ہو گیا۔۔۔۔اور۔۔۔۔"

انہوں نے سر اٹھا کر باری باری تینوں کی طرف دیکھا۔ عقیل کے ماتھے پر ناگواری سے شکنیں پڑی تھیں اور افروز کی رنگت کچھ اور زرد ہو گئی تھی۔

"دوسری بار تھراپی سے پہلے میں اسے دیکھنے ہسپتال گئی تھی۔ مجھ سے کہنے لگا۔ آنٹی! میری دادی کی عمر اسّی سال ہے اور وہ زندہ ہیں۔ اور میں صرف اٹھارہ سال کی عمر میں مر جائوں گا۔ دادی کو مزید زندگی نہیں چاہیئے، لیکن میں۔۔۔۔ میں تو زندہ رہنا چاہتا ہوں۔۔۔۔ لیکن بے چارہ لڑکا دوسری بار تھراپی کی اذیت نہ سہہ سکا اور مر گیا۔"

اور یہ سب بتاتے ہوئے ان کے چہرے پر کسی دکھ کا تاثر نہیں تھا۔ تمکین کو یوں لگا، جیسے اس کا دل دکھ سے پھٹ جائے گا۔ اس نے افروز کی طرف دیکھا، جس کا ہاتھ ذرا سا لرزا تھا اور عقیل ہاتھ میں پکڑا کپ ٹیبل پر رکھ کر یک دم کھڑا ہو گیا تھا۔

"میرا خیال ہے، اب چلنا چاہیئے۔"

"ارے، ارے۔۔۔۔ بیٹھو عقیل خان! ناشتہ تو کر لو۔" بڑا سا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے شہر بانو نے اس کی طرف دیکھا۔ تمکین بھی بے اختیار کھڑی ہو گئی تھی۔ اور پتہ نہیں، شہر بانو کو اتنے بلڈ کینسر کے مریض کہاں ملے تھے کہ وہ ہر روز کسی نہ کسی کا قصہ سناتی تھی۔

"آپ کی یادداشت پر حیرت ہوتی ہے آپا! پوری زندگی میں ملنے والے سب مریضوں کے نام، کیفیات سب ازبر ہیں آپ کو۔" عقیل کہہ رہا تھا۔

"بس، کیا بتائوں۔ جب جب افروز کو دیکھتی ہوں تو یہ سب یاد آجاتے ہیں۔ اللہ نہ کرے، جو افروز بھی۔۔۔۔"

تمکین نے باہر نکلتے نکلتے سنا۔ وہ اب وہاں مزید رکنا نہیں چاہتی تھی۔

"چائے تو پی لو تمکین!"

لیکن اُسے چائے بھی نہیں پینی تھی۔ آپا کے پاس سوائے نااُمیدی کے، کچھ نہیں تھا۔ اور وہ یہاں سے پوری نا اُمیدی کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔ اُس نے اپنی جھولی تو اُمید کے سکّوں سے بھر رکھی تھی۔ اور آپا یہ جھولی خالی کرنے پر تلی تھیں۔ لیکن وہ اس کے لئے تیار نہیں تھی۔

'نہیں۔۔۔۔ مجھے مایوس نہیں ہونا۔۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔'

بالوں میں تیزی سے برش کرتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا۔ تبھی آہستگی سے دروازہ کھول کر افروز اندر داخل ہوا اور ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہوا اور اُس کے لانبے ریشمی بالوں کو اپنے ہاتھوں پر لپیٹنے لگا۔

"تمہارے بال کتنے خوب صورت ہیں تمکین! کتنے ملائم، کتنے ریشمی۔" وہ انہیں ہاتھوں میں لئے کھڑا تھا۔

"پلیز، بالوں کی نرمی پھر کبھی کسی اور ٹائم چیک کیجئے گا۔ اب جلدی سے تیار ہو جائیں۔ اور مجھے بھی تیار ہونا ہے۔"

"پھر کبھی۔۔۔۔" اُس کے لہجے میں نامعلوم سی حسرت تھی۔ وہ اُس کے بال چھوڑ کر بیڈ پر بیٹھ گیا اور اسے جلدی جلدی چٹیا بناتے ہوئے دیکھنے لگا۔

"تمکین! اب بھی سوچ لو۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم نے سنا تھا، آپا کیا کہہ رہی تھیں۔"

"آپا کے پاس کہنے کے لئے اور ہے بھی کیا۔" وہ تڑپ کر مڑی تھی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اتنی پتھر دل کیوں ہیں۔"

"پتھر دل نہیں، حقیقت پسند۔" وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"حقیقت پسند۔۔۔۔ جہاں بات اپنے پیاروں کی ہو، افروز! وہاں حقیقت پسندی کہیں پیچھے رہ جاتی ہے۔" تمکین کے لہجے میں تلخی تھی۔ "اور آپا تو۔۔۔۔ حیرت ہوتی ہے، کیسے بات کر لیتی ہیں اس طرح کی۔"

"یہ مت بھولا کرو تمکین! کہ وہ میری نہ سگی بہن ہیں، نہ سوتیلی۔ وہ صرف اماں کی بیٹی ہیں۔ میرا ان سے حقیقی رشتہ صرف اتنا ہی ہے کہ۔۔۔۔"

"پتہ ہے مجھے۔ لیکن آپ ہی ان کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔"

"مجھے ایسا ہی لگتا ہے، تمکین! جب سے آیا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، آپ اُٹھیں، ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ میں نے کل ہی پیکنگ کر لی تھی۔ بس آپ تیار ہو جائیں۔"

"میں تیار ہی ہوں۔ مجھے چینج نہیں کرنا۔ لیکن تمو! میں نے ابھی کہا تھا کہ ایک بار پھر۔۔۔۔"

"رات کو اس موضوع پر حتمی بات ہو چکی ہے افروز!" اس نے قطعی لہجے میں کہا اور جوتے پہننے لگی۔

"اوکے، میم!" افروز کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ تمکین نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ جوتوں والے ریک کی طرف بڑھ رہا تھا اور اپنے جوتوں کے اسٹریپ بند کرتے ہوئے کتنے ہی آنسو اس کی آنکھوں میں مچل اٹھے۔

VVV

"افروز۔۔۔۔!"

تمکین نے بہت آہستگی سے اُسے بلایا تھا۔افروز نے آنکھیں کھول کر اسے نہیں دیکھا۔وہ سو رہا تھا۔ تمکین، جو اُس کی پائنتی کی طرف کھڑی تھی، ہولے ہولے چلتے ہوئے اس کے بیڈ کے دائیں طرف آکر کھڑی ہو گئی اور جھک کر اسے دیکھا۔اس کی سانس ہولے ہولے چل رہی تھی۔

ایک اطمینان بھری سانس لے کر وہ سیدھی ہو گئی۔اب اس کی نظریں افروز کے چہرے پر تھیں۔زرد رخساروں پر اس کی لانبی مڑی پلکوں کا سایہ،اُس کی خوب صورت اونچی ناک، کشادہ پیشانی پر بکھرے بال۔۔۔بے اختیار اُس نے دائیں ہاتھ سے اس کی پیشانی سے بال پیچھے ہٹائے۔وہ بہت کم سوتا تھا لیکن اس وقت گہری نیند سو رہا تھا۔ پچھلے پندرہ دنوں میں وہ کچھ اور کمزور ہو گیا تھا اور مایوس بھی۔ عقیل کے ساتھ جب وہ لاہور پہنچے تھے تو سفر کی تھکان سے وہ نڈھال تھا اور بے حد شاکی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا نا تمکین! مجھے کہیں مت لے کر جائو۔۔۔جو میرے لئے لکھا گیا ہے، وہ اٹل ہے۔اسے میں یا تم مٹا نہیں سکتے۔ پھر اب دیکھو مجھے لگتا ہے، جیسے میں۔۔۔۔''

''تم جانتے ہو کہ کیا لکھا گیا ہے؟ ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ کیا لکھا گیا ہے۔پھر خواہ مخواہ تمو کو پریشان مت کرو۔ تم تھک گئے ہو، رائٹ۔ ہم آج آرام کریں گے اور پھر کل ڈاکٹر کی طرف جائیں گے۔'' عقیل نے تمکین کے بجائے جواب دیا تھا۔اس رات وہ ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔

''یہاں میرا اپنا گھر بھی ہے، ماڈل ٹائون میں۔'' افروز نے ہوٹل میں بیڈ سے ٹیک لگاتے ہوئے تمکین سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔لیکن وہاں تو کرائے دار ہیں۔''

''ہاں، لیکن صرف ایک پورشن میں۔کل ہسپتال جانے سے پہلے ہم وہاں جائیں گے۔ میں تمہیں وہ گھر دکھائوں گا، جہاں میرے باباجانی کا بچپن، لڑکپن اور جوانی گزری۔بلکہ جوانی کے چند سال۔'' وہ بے حد تھکا ہوا تھا پھر بھی اس نے دیر تک عقیل اور تمکین سے باتیں کی تھیں۔اپنے بچپن کی بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں۔ باباجانی کے ساتھ گزرا وقت۔۔۔اُس کے پاس بتانے کے لئے بہت کچھ تھا۔انگلینڈ اور امریکہ کی باتیں، وہاں کی زندگی، وہاں کے مسائل اور پھر عقیل ہی اُسے سونے کی تاکید کرتا ہوا اُٹھ گیا تھا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے، تمو!'' عقیل کے جانے کے بعد اس نے کہا۔

''کس بات سے؟''

''ہسپتال جانے سے۔'' وہ اس وقت کسی ننھے بچے کی طرح لگ رہا تھا، جو انجکشن سے خوف زدہ ہو۔''سنا ہے، کیموتھراپی کا عمل بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔''

''کیا پتہ، ڈاکٹر کیا علاج تجویز کریں۔اور پھر ضروری تو نہیں کہ ہم یہاں، اسی جگہ علاج کروائیں۔ہم کہیں باہر بھی جا سکتے ہیں افروز! یہاں، شوکت خانم میں بہت ماہر ڈاکٹر ہیں۔ ہمیں ان کی رائے تو لینی ہے۔کیا خبر کوئی اچھی بات۔۔۔'' اس کے لبوں پر ایسی مسکراہٹ نمودار ہوئی، جیسے کوئی بڑا، کسی بچے کی نادانی پر مسکراتا ہے۔

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، تمکین! تم جو اتنی پُر امید ہو، جب اچانک میں چلا جاؤں گا تو کیسے برداشت کرو گی؟ کیسے سہہ پاؤں گی؟ پلیز، تمکین! اپنے آپ کو یہ حقیقت برداشت کرنے کے لئے تیار کرو۔"

"افروز! آپ اچھی بات نہیں کر سکتے کیا؟" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"چلو، اچھی باتیں کرتے ہیں۔" وہ مسکرایا۔ تمکین کی آنکھوں میں آنسو اس سے برداشت نہیں ہوتے تھے۔ وہ سوچتا تھا کہ وہ کبھی بھی اس سے کوئی ایسی افسردہ کر دینے والی بات نہیں کرے گا۔ لیکن پھر پتہ ہی نہیں چلتا تھا اور کوئی نہ کوئی بات کہہ جاتا تھا۔۔۔ پھر انہوں نے شادی کے ابتدائی تین ماہ کی ہر بات کو یاد کیا تھا اور اسی خوشی کو دوبارہ محسوس کیا تھا۔

"تم نے جھیل سیف الملوک دیکھی ہے۔۔۔؟" وہ جب ہنی مون کا پروگرام ترتیب دے رہے تھے تو افروز نے پوچھا تھا۔

"ایک بار بہت بچپن میں سکول کے ٹرپ کے ساتھ گئے تھے۔ پھر کبھی نہیں۔" اس نے بتایا تھا۔

"میں جب یہاں تھا تو چھٹیوں میں ہمیشہ جایا کرتا تھا۔ ہم عموماً ناران میں ٹھہرا کرتے تھے۔ کئی بار بابا بھی ہوتے تھے۔ ورنہ صرف عقیل اور میں۔۔۔ اور یار! تم کیسی لڑکی ہو؟ ایبٹ آباد میں رہ کر کبھی جھیل سیف الملوک دیکھنے نہیں گئیں۔" وہ حیران ہوا تھا۔

"ہم بھلا کیسے جا سکتے تھے؟ آپی کا تو پتہ ہے نا آپ کو۔ اور ابی جان تو آپی کی وجہ سے کہیں جاتے ہی نہیں تھے۔"

"اوہ ہاں، ٹھیک ہے۔ تو پھر پہلے ہم جھیل سیف الملوک دیکھنے جائیں گے۔ تمہیں کیا بتاؤں، کس قدر خوب صورت جگہیں ہیں یہ۔"

"اور شنگریلا (اسکردو)۔۔۔؟" اُس نے ایک بار شنگریلا کے متعلق پڑھا تھا اور اسے بہت اشتیاق تھا وہ جگہ دیکھنے کا۔

"سب دیکھیں گے۔۔۔ گلگت کے برف زار، کشمیر کے لالہ زار۔ میں تمہارے سنگ ہر خوب صورت جگہ پر جاؤں گا۔ لیکن پہلے جھیل سیف الملوک پر چلیں گے اور آنسو جھیل بھی دیکھیں گے۔" وہ اسے ان جگہوں کے متعلق بتاتا رہا۔ لیکن بتانے اور دیکھنے میں بہت فرق تھا۔

بالا کوٹ میں انہوں نے صرف ایک رات قیام کیا تھا اور ہوٹل سے باہر نکل کر وہ صرف سیّد احمد شہید کے مزار تک گئے تھے۔ یا پھر کچھ دیر باہر پتھروں پر بیٹھے وہاں کا حُسن اور خوب صورتی محسوس کرتے رہے تھے۔ واپسی میں ایک جگہ اُس نے ایک چھوٹی سی دکان پر لکڑی کے بے حد خوب صورت ڈیکوریشن پیس دیکھے تھے۔

"واپسی پر لیں گے۔" افروز نے کہا تھا۔ "اور واپسی پر دو دن بالا کوٹ میں رُکیں گے بھی۔"

اگلی صبح ناشتے کے بعد وہ ناران کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ عقیل کے بار بار کہنے پر افروز نے اپنی جیپ وہاں بالا کوٹ میں چھوڑ دی تھی۔

"یار! تم ایک طویل عرصے بعد یہاں آئے ہو۔اور پھر ان راستوں پر پہلے بھی تم نے کبھی زیادہ سفر نہیں کیا ہے۔یہاں صرف ماہر ڈرائیور ہی جو اُن راستوں سے آشنا ہوں، سفر کر سکتے ہیں۔میں نے اپنی آنکھوں سے کئی حادثے ہوتے دیکھے ہیں۔یار! مجھے کسی انہونی سے ڈر لگتا ہے۔دیکھو، تم وہاں ہوٹل سے کوئی جیپ ہائر کر لینا۔"

"اوکے۔۔۔" بالآخر افروز نے اسکی بات مان لی تھی اور وہ صبح سویرے ایک کرائے کی جیپ پر ناران کے لئے روانہ ہوئے تھے۔جیپ میں ان کے علاوہ بھی چار افراد تھے اور افروز بہت جز بز ہو رہا تھا۔

"ہم اپنی شادی کے بعد پہلی بار کسی سفر کے لئے نکلے ہیں اور غالباًیہ ہمارا ہنی مون ہے اور ہم اجنبیوں کی طرح منہ بند کئے بیٹھے ہیں۔اور یہ عقیل بھی خوا مخواہ ہی۔۔۔میں تو انہی پہاڑوں میں پل کر بڑا ہوا ہوں۔اب اگر ہم دونوں تنہا ہوتے ہیں تو تم میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوتیں اور میں ان پیچ در پیچ خم کھاتے راستوں میں ڈرائیو کرتے ایک طرف اونچے پہاڑوں اور دوسری طرف گہری کھائیوں میں تکتے ہوئے تم سے کئی رومینٹک باتیں کرتا۔۔۔وہ باتیں جو اس ایک ہفتے میں تم سے نہیں کر سکا اور اس بل کھاتی سڑک پر کہیں کسی جگہ جیپ روک کر کسی ٹیلے، کسی پتھریلے پہاڑ سے ٹیک لگا کر میں تمہاری کئی تصویریں بناتا اور تمہیں ان سفروں کا احوال بتاتا، جو میں نے تمہارے بغیر کئے ہیں اور جن سفروں میں ہمیشہ مجھے تمہاری کمی محسوس ہوتی رہی ہے۔لیکن تب میں بالکل بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ نامعلوم سی کمی تمہارے ساتھ نہ ہونے کی ہے۔"

یہ ساری باتیں اس نے کاغان میں ایک باغ میں سیب کے درخت سے ٹیک لگائے لگائے اس سے کہی تھیں اور وہ ہنستی رہی تھی۔وادی کاغان کا نام اسی چھوٹے سے گاؤں کے نام پر رکھا گیا تھا۔جیپ والے نے یہاں جیپ روکی تھی اور کہا تھا۔

"جس کسی نے کچھ کھانا پینا ہے، کھالے۔" اور خود بھی وہ ایک چھوٹی سی دکان میں گھس گیا تھا اور باقی کے چاروں ٹورسٹ بھی جیپ سے اتر گئے تھے۔وہ راولپنڈی سے آئے تھے اور تھوڑی بہت بات چیت افروز کے ساتھ ان کی ہوئی تھی۔وہ غالباًاسٹوڈنٹ تھے۔اب تک ان میں کچھ زیادہ بے تکلفی نہیں ہو سکی تھی۔

"یہاں پتہ نہیں کچھ کھانے کو بھی ملے گا یا نہیں۔" اُس نے پوچھا تھا۔تب افروز اسے ایک چھوٹے سے چھپر نما ہوٹل میں لے آیا تھا، جہاں ایک شخص تندور میں روٹیاں لگا رہا تھا۔جبکہ کچھ لوگ بینچوں پر بیٹھے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لکڑی کی میزوں پر ایک چھوٹا لڑکا روٹیاں اور پلیٹیں رکھ رہا تھا۔ان کے ساتھی بھی یہاں بیٹھے تھے۔غالباًانہوں نے آرڈر دے رکھا تھا۔ایک شناسا سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر انہیں دیکھ کر آئی تھی۔ افروز نے چپلی کباب اور روٹی کا آرڈر دیا اور آرڈر دے کر وہاں بیٹھنے کے بجائے وہ تمکین کا ہاتھ پکڑ کر چھپر کے پیچھے موجود باغ میں گھس آیا تھا۔باغ درختوں سے بھرا ہوا تھا۔اکثر درختوں پر پھل نہیں تھے۔پتہ نہیں وہ کس چیز کے درخت تھے۔لیکن کہیں کہیں درختوں پر سیب تھے۔لیکن وہاں زمین پر بہت گندگی تھی۔

"انہونی ہونی ہو تو لاکھ تدبیریں کرو، پھر بھی ہو جاتی ہے۔اور مجھے اس سے عقیل سے زیادہ غصہ خود پر آرہا ہے کہ میں نے عقیل کی بات کیوں مانی۔"

افروزاسے دیکھتا تواس کی آنکھوں سے محبت کی روشنی سی پھوٹتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ وہاں کسی خالی بینچ پر کھانا تیار ہونے کے انتظار میں کیوں نہیں بیٹھا تھا۔

وہاں اتنے سارے مردوں میں وہ تنہا عورت تھی اور پھر جب چھپر سے لڑکے نے کھانا تیار ہونے کی آواز لگائی تووہ دونوں کسی انہونی کے تصور میں لپٹے بینچ پر آکر بیٹھ گئے تھے۔ روٹیاں گرم تھیں لیکن کبابوں میں اسے ریت سی دانتوں تلے آتی محسوس ہوئی۔ فضا میں چربی پگھلنے کی مخصوص مہک تھی۔ تمکین نے آدھا کباب کھا کر چھوڑ دیا تھا۔ یہ اس کباب سے بالکل مختلف ذائقے کا تھا، جو اس نے ایک بار پشاور کے قصہ خوانی بازار میں کھایا تھا۔ افروز کے دانتوں کے نیچے بھی شاید کرچ کرچ ہوئی تھی، یا پھر پلاسٹک کی پلیٹوں کے چکنے کنارے جنہیں شاید کبھی بھی اچھی طرح نہیں دھویا گیا ہوگا، دیکھ کر اس کا دل ایسا متلایا تھا کہ وہ کھانا ادھورا چھوڑ کر ہی کھڑا ہو گیا۔

"کھانا ناران جاکر ہی کھائیں گے۔"

وہ جیپ کی طرف آگئے تھے۔ جبکہ ان کے ہم سفر بہت شوق سے کھا رہے تھے۔

"یہاں کاغان میں بھی اچھے ہوٹل ہونے چاہئیں۔ پہلے میں جب آیا تھا تو میں نے یہی سوچا تھا۔" افروز نے جیپ میں بیٹھتے ہوئے تبصرہ کیا تھا۔ پھر ناران تک وہ خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے تھے۔ یا پھر دائیں طرف اونچے پہاڑوں اور بائیں طرف نیچے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے دریائے کنہار کو جو کبھی نظر آتا اور کبھی غائب ہو جاتا۔

جب وہ ناران پہنچے تو ناران میں ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ جب وہ ہوٹل میں اپنے کمرے میں پہنچے تو انہیں ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھتے اوپر ٹیرس پر بیٹھے بے شمار لوگ نظر آئے۔ کچھ اپنا سامان اٹھائے آرہے تھے، کچھ جا رہے تھے۔ بہت رونق تھی۔

یہ جولائی کا وسط تھا۔ لوگ نہ جانے کہاں کہاں سے آرہے تھے اور وہ اتنے عرصے سے یہاں ایبٹ آباد میں تھی اور ایک بار بھی یہاں نہیں آئی تھی۔

افروز واش روم میں گیا تو وہ کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ سامنے اونچے پہاڑ تھے، برف سے ڈھکے۔ سفید برف پر ڈوبتے سورج کی کرنیں پڑتی تھیں اور وہ مبہوت سی اسے دیکھتی رہی۔ پہاڑ سے اِدھر بالکل کھڑکی سے نیچے ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ گھر کے سامنے ڈھلوان پر سیڑھیوں کی شکل میں ننھا سا کھیت تھا، جس میں چھوٹے چھوٹے سبز پودے سر اٹھا رہے تھے اور چمنی سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ یہ بالکل ویسا ہی گھر تھا، جیسے گھر اس نے راستے میں دیکھے تھے جیسے پہاڑی علاقوں میں ہوتے ہیں۔ سیڑھیوں والے چھوٹے چھوٹے کھیت گھر کے عقب میں دائیں بائیں یا سامنے چھوٹا سا ڈھلوانی چھت والا گھر۔

"ہم جب ہوٹل سے باہر جائیں گے گھومنے تو میں اس گھر کو قریب سے جاکر دیکھوں گی۔" کھڑکی کے شیشے سے ناک ٹکاتے ہوئے اس نے دور برف پوش پہاڑ کو دیکھا، جس کی سفید برف پر ڈوبتے سورج کی سرخی تھی۔

"مجھے گھروں کی چمنیوں سے اُٹھتا ہوا دھواں بہت فیسی نیٹ کرتا ہے۔" افروز نہ جانے کب اس کے پاس آکر کھڑا ہوا تھا اور اب اس کے بالکل قریب شیشے سے ناک ٹکائے کھڑا تھا۔

"پتہ ہے، تمکین! میں نے جب جب سفر کئے، دور دراز بستیوں اور شہروں کے۔ مجھے سیاحت کا ہمیشہ بہت شوق رہا ہے اور میں چھٹیوں میں ہمیشہ نکل جاتا تھا کہیں بھی۔ جب پاکستان میں تھا تب بھی اور جب ملک سے باہر چلا گیا تب بھی۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ جب کبھی لمبے سفر کے بعد دُور سے گھروں سے اُٹھتا دھواں نظر آتا تو میں مسحور سا ہو جاتا تھا۔ پتہ نہیں تمکین! یہ دھواں مجھے کیوں اتنا مسحور کر دیتا ہے۔ جیسے زندگی ان گھروں کے اندر دھڑک رہی ہے۔ یہ دھواں زندگی کی علامت ہے۔ پتہ ہے، بہت بار سینکڑوں بار میں ان دھواں اُٹھتے گھروں کے اندر تصور ہی تصور میں گیا ہوں۔ ایک نرم گرم حدت میں لپٹا گھر۔۔۔۔ چولہے کے سامنے بیٹھی ماں اور آس پاس بیٹھے بچے اور کھانا پکاتے ہوئے گاہے بہ گاہے، مامتا بھری نظر بچوں پر ڈالتی ماں۔ ایک مکمل گرہستی۔ یہ منظر اتنا مکمل ہوتا ہے، اتنا بھرپور کہ میں اس منظر سے باہر نہیں نکل پاتا۔"

اور وہ بھی جیسے اس منظر میں ڈوب سی گئی تھی۔

دور پیچھے برف سے ڈھکے پہاڑ تھے اور ان کے دامن میں ہوٹل کے اس کمرے کی کھڑکی سے بالکل نزدیک ایک چھوٹے سے ٹیلے پر بنا مکان، اُس کی چمنی سے نکلتا دھواں، اندر چولہے کے گرد بیٹھی ماں اور اس کے گرد کھانے کا انتظار کرتے بچے۔

"تمکین!" افروز نے کھڑکی کے شیشے سے ناک ہٹا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "کچھ کھانے چلیں؟"

"نہیں، اب رات کو ہی کھانا کھائیں گے۔ اس وقت چائے۔"

"میں چائے منگواتا ہوں۔" وہ باہر نکل گیا اور وہ ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ یہ ہوٹل کی بیک سائیڈ تھی۔ نیچے دو بچے ننگے پاؤں پتھروں پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ برف سے ڈھکے پہاڑ سرمئی ہوتے جا رہے تھے۔ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئی۔

افروز چائے کا کہہ کر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ بیگ سے اپنے کپڑے نکالنے لگی۔ ابھی کپڑے نکال کر بیڈ پر رکھے ہی تھے کہ افروز اور اس کے پیچھے ٹرے اٹھائے ایک لڑکا تھا۔ لڑکے نے ٹرے تپائی پر رکھی اور بیڈ پر بکھرے کپڑوں کو دیکھا۔

"سر! آپ اِدھر کمرے میں استری مت لگائیے گا۔ لائٹ چلی جائے گی۔ جنریٹر چل رہا ہے۔ آپ کپڑے مجھے استری کے لئے دے دیں۔"

"آج سے دس سال پہلے جب میں یہاں آیا تھا، تب بھی یہی مسئلہ تھا۔ اور آج بھی۔۔۔۔ یعنی ابھی تک بجلی کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔"

لڑکا ابھی تک کھڑا تھا۔ تب تمکین کو خیال آیا کہ وہ شاید کپڑوں کے لئے کھڑا ہے۔

"نہیں۔۔۔۔ مجھے کپڑے استری نہیں کروانے۔"

"پتہ ہے تمکین! ہم چند دوست جب اِدھر آتے تھے نا، تو الیکٹرک کیٹل میں چائے بناتے تو کوئی نہ کوئی بھاگا چلا آتا، چیک کرنے کے لئے کہ کہیں ہم نے استری تو نہیں لگائی۔ میں تب بھی سوچا کرتا تھا کہ یہاں کئی جگہوں پر چھوٹے چھوٹے ڈیم بنا کر بجلی پیدا کی جاسکتی ہے۔ خود کفیل ہو سکتے ہیں یہ لوگ۔۔۔۔ موسمِ سرما میں اکثر کیبل ٹوٹ جاتی ہے اور بجلی کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔" چائے اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے افروز اُسے بتانے لگا تھا۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

"یار! وہ جیپ والے ہم سفر لڑکے مل گئے تھے۔ وہ بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں نے جھیل تک جانے کا پروگرام اُنہی کے ساتھ بنالیا ہے۔ صبح اکٹھے چلیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

تمکین کچھ تھک سی گئی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ چائے پی کر افروز کے ساتھ باہر ٹیرس پر آگئی۔ اگرچہ ہلکی ہلکی بوندا باندی اب بھی ہو رہی تھی، لیکن ٹیرس پر برآمدے میں کرسیاں بچھائے جگہ جگہ لوگ بیٹھے تھے۔ سیزن کی وجہ سے رش بہت تھا۔ باہر کہیں کہیں روشنیاں جل رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر ریلنگ پر ہاتھ رکھے سامنے دیکھتی رہی۔ دور پہاڑ اندھیرے میں ڈوبے تھے اور پانی کا شور تھا۔ اگرچہ دریا نظر نہیں آرہا تھا۔

"تمکین! بھیگ کر بیمار پڑ جاؤ گی۔ اِدھر آجاؤ۔" افروز نے اُسے پکارا تو وہ اُس کے قریب ہی آکر بیٹھ گئی۔ ان سے ذرا فاصلے پر کراچی کی کوئی فیملی بیٹھی تھی۔ ان میں ادھیڑ عمر عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی۔ یہ سب لوگ

جھیل سیف الملوک دیکھنے آئے تھے۔ اپنے حلیے اور لباس سے وہ کوئی بہت دولت مند لوگ لگتے تھے۔ لیکن نیچر کو، پہاڑوں کو دیکھنے کا عشق انہیں یہاں لے آیا تھا۔ وہ سب کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی اور افروز سے باتیں بھی کرتی جارہی تھی۔ فضا میں گوشت بھوننے کی خوشبو تھی۔ دائیں طرف ٹیرس کے ریلنگ سے اس نے دیکھا تھا، ارم ہوٹل کے لان میں آگ جل رہی تھی۔ چکن تکہ اور مٹن تکہ بن رہا تھا۔ کہیں بینچوں پر پورا مرغ لٹکا ہوا تھا۔

"ارم ہوٹل کا چرغہ بہت اچھا تھا۔ جب آخری بار میں یہاں آیا تھا تو ہم اکثر ڈنر اِدھر ہی کرتے تھے۔" افروز نے بتایا۔ "اور آج بھی ڈنر ارم ہوٹل میں ہی کریں گے۔"

اور جب وہ افروز کے ساتھ ارم ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں جارہی تھی تو اس نے لان میں سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ آگ پر بڑے بڑے کڑاہ دھرے تھے، جن میں خستہ پراٹھے تلے جارہے تھے۔ انہوں نے چکن تکہ اور فرنچ فرائز منگوائے تھے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہاں ناران میں انہیں اتنا زبردست ڈنر ملے گا۔

اور جب وہ باہر نکلے تھے تو فضا میں خنکی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور پانی کا شور ترل ترل کانوں میں آتا ۔۔۔ اور یہ سب اسے اچھا لگ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا، وہ کچھ دیر یونہی سڑکوں پر چلتی رہے۔ لیکن افروز کچھ تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اور پھر صبح انہیں جھیل سیف الملوک دیکھنے بھی جانا تھا۔ اور ان کے ہم سفر لڑکوں نے کچھ دیر پہلے ارم ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں بتایا تھا کہ انہوں نے جیپ والے سے بات طے کر لی ہے اور صبح بہت سویرے نماز کے فوراً بعد وہ نکلیں گے۔ اس لئے وہ واپس ہوٹل میں آگئے تھے۔

VVV

افروز نے کچھ بڑبڑاتے ہوئے کروٹ بدلی تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ اب اس کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔ اس کی گردن پر کان سے ذرا نیچے سیاہ تل تھا، جسے وہ بہت دھیان سے دیکھ رہی تھی۔ افروز غالباً سوتے میں بڑبڑایا تھا۔ ایک بار پھر اس نے کچھ کہا۔ تمکین نے دھیان سے سنا تو حیرت زدہ رہ گئی۔

"تمو! یہ سامنے برف سے ڈھکا پہاڑ، ملکہ پربت ہے۔ جھیل سیف الملوک کا حُسن۔۔۔۔اور ہم یہاں بہت سویرے اس لئے آئے ہیں کہ سورج کو طلوع ہوتے دیکھیں۔"

"نہیں۔۔۔۔" وہ بے یقینی سے اس کی گردن کے سیاہ تل کو دیکھے جا رہی تھی۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ بیک وقت دونوں ماضی کے ایک ہی منظر میں جا پہنچے ہوں۔" وہ سو رہا تھا اور وہ جاگ رہی تھی لیکن دونوں اس وقت جھیل سیف الملوک کے پاس کھڑے ملکہ پربت کو دیکھ رہے تھے۔ وہ حیران سی اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اُس کی نظریں افروز کی پیٹھ اور اُس کی گردن کے تل کو تک رہی تھیں، لیکن ذہن ماضی میں سفر کر رہا تھا۔ ماضی، جو بہت پرانا نہیں تھا، بس چند ماہ پہلے کی ہی تو بات تھی۔ جب وہ جیپ سے اُتر کر

گلیشیر پر سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتی چل رہی تھی، اُس کے ساتھ افروز تھا اور آگے پیچھے انجانے لوگ تھے۔ جھیل سیف الملوک تک کا سفر بہت خطرناک تھا۔ کئی بار تو اسے لگا تھا جیسے ابھی جیپ کسی کھائی میں گر جائے گی۔ ایک طرف اونچے پہاڑ، دوسری طرف گہری کھائیاں، جن میں چیڑ کے اونچے اونچے درخت تھے اور پھر آگے یہ بڑا گلیشیر تھا۔

"اُدھر جیپ نہیں جا سکے گی۔" ڈرائیور نے بتایا تھا اور وہ برف کے اُس گلیشیر پر چل رہے تھے۔ سہم سہم کر، مضبوطی سے پاؤں جما کر۔ اور برف اس کے قدموں کے نیچے میلی ہوتی تھی۔ بالآخر وہ گلیشیر کا سفر طے کر کے اس تنگ راستے پر چلنے لگے تھے، جس پر بہ مشکل ایک ساتھ دو افراد چل رہے تھے۔ کہیں کہیں تو اتنی تنگ جگہ ہو جاتی تھی کہ ایک ہی فرد چل پاتا تھا۔ وہ خوف سے اپنے آگے دوڑتے چھ سات سالہ بچے کو دیکھتی تھی جو بار بار اپنی ماں کی اُنگلی چھڑا کر آگے بھاگنے لگتا تھا۔ اور پھر آگے تھوڑی سی کھلی اور چوڑی جگہ پر وہ چھوٹا سا ریسٹورنٹ تھا، جہاں چائے پی کر وہ پھر ذرا سا نیچے اُترے تھے۔ سامنے ملکہ پربت اپنی پوری شان سے کھڑا تھا۔ کسی سفید لباس میں ملبوس دُلہن کی طرح برف سے ڈھکا۔ اُس کی سفید برف سورج کی روشنی سے چمکتی تھی اور تمکین حیرت سے اسے دیکھتی تھی اور پھر جھیل سیف الملوک کے کنارے بیٹھے ہوئے انہوں نے وہاں موجود گائیڈ سے وہی گھسی پٹی کہانی سنی تھی۔

"جھیل کی گہرائی۔۔۔۔ایک بار ایک انگریز نے اس میں رسّی پھینکی، گہرائی ناپنے کے لئے۔ اور رسّی ختم ہو گئی۔" وہ شخص بتا رہا تھا اور تمکین آنکھوں میں حیرانی بھرے جھیل کے سبز پانیوں کو دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ یہ پیالہ نما جھیل کیا سچ مچ اتنی ہی گہری ہے؟ اور کیا واقعی یہاں کبھی شہزادہ سیف الملوک آتا تھا۔

پھر وہاں انہیں پروفیسر صفی اللہ ملے تھے۔ان کے ساتھ ان کی تیرہ چودہ برس کی بیٹی تھی۔وہ ہر سال کراچی سے ناران آتے تھے اور اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے جہاں وہ تھے۔ان کی رفاقت سے افروز اور وہ دونوں بہت ہی خوش ہوئے تھے۔ان کی گفتگو میں سحر تھا۔وہ خوش مزاج تھے اور اُن کے اندر جیسے علم کے خزانے بھرے تھے۔اور پھر اُن کے اندر عجیب طرح کی سادگی اور دلکشی تھی۔وہ جتنے دن ناران میں رہے، پروفیسر صاحب کی کمپنی کو انہوں نے بہت انجوائے کیا تھا۔اگلے بہت سارے پروگرام اکٹھے ہی بنائے تھے۔جن میں لالہ زار، لولوپٹ سر اور پیالہ جھیل اور پھر شوگراں کا سفر تھا۔

لالہ زار کا راستہ تو جھیل سیف الملوک سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔تمکین کو تو یوں لگتا تھا، جیسے ابھی کسی لمحے جیپ کھائی میں گر جائے گی۔اور پھر لالہ زار۔۔۔۔وہاں جا کر یوں لگتا تھا، جیسے وہ قدرت کے

بے حد قریب ہوں۔ہر طرف سبزہ ہی سبزہ۔اونچے اونچے ٹیلے، سبزے سے بھرے۔اوپر اونچائی پر صرف ایک ٹوٹا پھوٹا سا ہٹ تھا اور بس۔وہاں آبادی نہیں تھی۔ایک لاہور سے آنے والے میاں بیوی تھے اور ایک وہ تھے۔چاروں لڑکے، پروفیسر صاحب، اُن کی بیٹی۔اسے اور افروز کو تو جیسے لالہ زار کے حُسن نے جکڑ لیا تھا۔وہ مبہوت سے، سبزے پر کھڑے تھے اور اپنے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔افروز نے اس کا ہاتھ تھاما۔

''تمکین! زندگی تمہاری رفاقت میں بہت خوب صورت ہو گئی ہے۔'' جذبات سے اس کی آواز بوجھل ہو رہی تھی۔جب لاہور سے آنے والی خاتون دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔

''یہ۔۔۔۔یہ سبزہ دیکھنے کے لئے ہم نے اتنا خطرناک سفر کیا ہے۔'' شاید راستے میں جو خوف وہ برداشت کرتی آئی تھی، وہ اب برداشت کی حدیں توڑ کر ظاہر ہو گیا تھا۔یہ صرف اونچے ٹیلے اور سبزہ نہیں تھا، یہ کچھ اور بھی تھا، جسے بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔انہوں نے تقریباً تین چار گھنٹے وہاں گزارے تھے۔یہ چند گھنٹے تمکین کی زندگی کا خوب صورت ترین وقت تھا۔

وہ پندرہ دن ناران میں رہے تھے اور دن کا ہر لمحہ اُن کی زندگی کا خوب صورت ترین لمحہ تھا۔وہ صبح ناشتہ کرنے کے لئے ہوٹل سے نکلتے تھے۔زیرو پوائنٹ پر یہ جگہ افروز نے تلاشی تھی۔یہ بظاہر چھوٹا سا ریسٹورنٹ تھا۔چھوٹا سا برآمدہ جس میں کرسیاں اور میزیں رکھی تھیں اور ایک کچن، ایک یا دو کمرے تھے اور بس۔۔۔۔برآمدے کی پیشانی پر بڑا سا بٹ شیف لکھا ہوا تھا۔یہاں پر وہ مزیدار پراٹھوں اور آملیٹ کا ناشتہ کرتے تھے۔کبھی کبھی وہ آلو کی بھجیا بھی منگواتے تھے۔دو تین بار ٹرائوٹ مچھلی بھی یہاں سے ہی کھائی تھی۔

چڑھائی چڑھنے سے ان کی بھوک کھل جاتی تھی۔پھر وہ کہیں آگے نکل جاتے۔پی ٹی ڈی سی کے موٹیل کے پاس اس سے آگے کسی ریسٹ ہائوس کی طرف اوپر چڑھتے ہوئے چھوٹی چھوٹی چیریز اُن کے پائوں کے نیچے آتی تھیں اور وہ حیران ہو کر سوچتی تھی کہ یہاں اتنا پھل ضائع ہوتا ہے تو انہیں محفوظ کر کے شہروں میں بھجوانے کا انتظام کیوں نہیں کیا جاتا۔یہ چیری سفید، ریڈ اور بلیک۔

''ہمارے ہاں کہیں بھی صحیح ایڈمنسٹریشن نہیں ہے۔'' افروز نے کہا تھا۔''ورنہ ہمارے ملک میں کوئی بھی غریب نہیں رہ سکتا۔تمہیں پتہ ہے، اس بار ان کے کھیت خالی ہیں۔انہوں نے کچھ نہیں اُگایا۔ایک لڑکا مجھے بتا

رہا تھا کہ پچھلے سال اتنے آلو ہوئے تھے یہاں کہ ہمارے اسٹور بھرے ہوئے ہیں آلوئوں سے۔ سو یہاں بہت کم آلو اگائے جاتے ہیں۔ جبکہ پچھلے سال کا اسٹاک ایسے ہی پڑا ہے۔ اور وہ کراچی والے پروفیسر صاحب بتا رہے تھے کہ وہاں کراچی اور پنجاب میں آلو چالیس پچاس روپے کلو فروخت ہو رہا ہے۔ اگر دوسرے صوبوں میں یہاں سے آلو بھجوانے کا انتظام ہو جائے تو بدلے میں وہاں سے گندم منگوائی جا سکتی ہے۔ یہ لوگ بھی خوش حال ہو جائیں گے اور دوسرے صوبوں میں بھی آلو مہنگے نہیں رہیں گے۔"

"تبھی فرنچ فرائز کی اتنی بڑی ڈش اتنی کم قیمت میں ملی ہے یہاں۔"

پھر ایک دن انہوں نے بٹ شیف سے شاشلک اور چکن کارن سوپ لیا تھا، جو کسی بھی طرح کسی بڑے ہوٹل سے کم نہیں تھا اور قیمت انتہائی مناسب۔ ناشتے کے علاوہ وہ لنچ بھی یہاں ہی آ کر کرنے

لگے تھے۔ ایک دو بار انہوں نے شکاریوں سے ٹرائوٹ خرید کر یہاں سے بنوائی تھی۔

ایک دن پروفیسر صاحب نے لولوپٹ سر دیکھنے کا پروگرام بنایا اور ان سے بھی چلنے کو کہا۔

"جھیل بہت خوب صورت ہے، لیکن راستہ بہت خطرناک ہے۔ لالہ زار سے بھی زیادہ خطرناک۔ لیکن اس کی خوب صورتی کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔"

"میں ایک بار آنسو جھیل دیکھنے گیا تھا۔" افروز نے بتایا۔ "لیکن یہ لولوپٹ سر میں نے نہیں دیکھی۔"

"تو پھر پروگرام بنا لیں۔" پروفیسر صاحب نے اصرار کیا تو اگلے روز جانے کا پروگرام بن گیا۔ وہ چاروں لڑکے بھی ان کے ساتھ تھے۔ پروفیسر صاحب نے جیسے بتایا تھا، جھیل اس سے بھی کہیں زیادہ خوب صورت تھی۔ اور پیالہ جھیل دیکھتے ہوئے وہ یہاں پہنچے تھے اور اب اوپر سے پہاڑوں کے دامن میں موجود اس جھیل کو دیکھ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا، جیسے نیچے کسی نے ہیروں کا فرش بچھا دیا ہو۔ سورج کی روشنی کچھ اس زاویے سے شفاف پانی پر پڑتی تھی کہ آنکھوں کے سامنے ہیرے دمکتے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر تک مبہوت کھڑے دیکھتے رہے۔

"آگے دودھوپٹ سر ہے۔" پروفیسر صاحب نے انہیں بتایا۔ "لیکن وہاں تک جیپ نہیں جا سکتی۔ کچھ سفر گھوڑوں یا خچروں پر کرنا پڑتا ہے۔"

لیکن شدید خواہش کے باوجود وہ جھیل دودھوپٹ سر نہیں جا سکے تھے۔ کیونکہ افروز کو ٹمپریچر ہو گیا تھا اور وہ بہت تھکن بھی محسوس کر رہا تھا۔

واپس ناران آ کر اس کا ٹمپریچر دو تین دن تک اسی طرح رہا تھا۔ وہ تو گھبرا گئی تھی۔ لیکن پروفیسر صفی اللہ کے پاس میڈیسن باکس تھا۔ اور ان کی دی ہوئی ٹیبلٹ سے ٹمپریچر نہیں رہا تھا۔ پھر بھی دو تین دن تک وہ ہوٹل سے باہر نکل کر کہیں نہیں گئے تھے۔ بس شام کے وقت دریا کے کنارے بیٹھ کر پانی کو پتھروں پر اچھلتے کودتے گرتے ہوئے دیکھتے تھے اور وہ ننھے بچوں کی طرح اس میں کاغذ کی کشتیاں بنا بنا کر ڈالتی رہتی تھی۔

"دریائے کنہار کا پانی بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ یخ۔۔۔" بالاکوٹ میں اس نے دریا کے پانی میں ہاتھ ڈال کر دیکھا تھا۔ ایک بار جب کالج ٹرپ کے ساتھ آئی تھی اور کسی نے بتایا تھا کہ اگر کوئی یہ یخ پانی پی لے تو اسے پتھر بھی ہضم ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے سکول، کالج اور بچپن کی باتیں افروز سے شیئر کرتی اور دریا کے قریب بنے چھوٹے سے ریسٹورنٹ سے چائے منگوا کر پی جاتی۔ اور جب اندھیرا پھیلنے لگتا تو وہ ارم ہوٹل سے ڈنر کر کے واپس اپنے ہوٹل میں آجاتے تھے۔

پروفیسر صفی اللہ اور ان کی بیٹی دودھوپٹ سر دیکھ کر واپس آئے تو واپسی کا پروگرام بن گیا اور یہ طے پایا کہ اب واپسی پر دو تین دن شوگران میں ٹھہریں گے۔

"تو آج آخری بار ناران میں گھوم لیں۔" افروز کی طبیعت کافی بہتر تھی۔ چنانچہ پروفیسر صاحب کے ساتھ پروگرام طے کرنے اور جیپ والے سے معاملہ طے کرنے کے بعد افروز نے کہا۔

"آخری بار کیوں افروز! ہم انشاءاللہ اگلے سال بھی آئیں گے۔ بلکہ ہر سال آیا کریں گے۔" اس نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"اور بٹ شیف کا ناشتہ ور شاشلک کھائیں گے۔" افروز ہنسا۔ "ویسے تم یوں ہی خوف زدہ ہو گئی ہو۔ میرا مطلب تھا، اس ٹرپ میں آخری بار۔ ہمیں تو ابھی بہت سارے دن ایک دوسرے کی رفاقت میں گزارنے ہیں تمکین!۔۔۔ ویسے جب تمہارے منہ میں دانت نہیں رہیں گے اور میرے سر پر بال نہیں رہیں گے تو ہم کیسے لگیں گے؟" وہ ہنسا۔

"پتہ نہیں۔" وہ ابھی تک اتنی فضول بات کرنے پر خفا تھی اور اس روز افروز نے اسے بہت ہنسایا تھا۔ لطیفے سنا سنا کر اور جب وہ واپس ہوٹل کی طرف آرہے تھے۔ وہاں انہوں نے زیرو پوائنٹ پر ہی ایک جگہ لوگوں کا ہجوم دیکھا۔

"کیا ہوا۔۔۔؟" افروز نے ایک شخص سے پوچھا۔

"لاش ہے سر! لاہور کا ایک کوہ پیما تھا۔ ملکہ پربت سر کرنے کے لئے آیا تھا، لیکن زخمی ہو گیا تھا۔ اُس کا ساتھی اُسے وہاں چھوڑ کر نیچے مدد کے لئے آیا تو یک دم برف باری شروع ہو گئی اور تین دن مسلسل ہوتی رہی۔ یہ برف تلے دب گیا تھا اور اب برف پگھلی ہے تو اس کا ہاتھ نظر آیا ہے تو پھر یہ لاش لائی گئی ہے نیچے۔۔۔۔ لاہور سے اس کی بہن آئی ہوئی ہے اسے لینے۔"

وہ یک دم آگے بڑھی تھی، دیکھنے کے لئے۔ جب یونیفارم میں ملبوس ایک شخص نے اسے روکا۔ وہ اب پتہ نہیں پولیس کا آدمی تھا یا کوئی رضاکار تھا۔

"بی بی! آگے جا کر مت دیکھیں تو بہتر ہے۔" لیکن پھر بھی اس نے قدرے آگے ہو کر اس کی جھلک دیکھی تھی۔ وہ اس شخص کو دیکھنا چاہتی تھی جو نہ جانے چھ ماہ یا آٹھ ماہ برف تلے دبا رہا تھا۔ اس نے تابوت میں پڑے اس کے چہرے کی بس جھلک ہی دیکھی تھی۔ اس کی رنگت ایسی ہو رہی تھی، جیسے نیلی سیاہی میں ہلکا جامنی رنگ ملا ہو۔ ایک دم نیلا رنگ تھا۔ وہ پیچھے ہٹ آئی تھی۔

”اور یہ کیا جنون ہوتا ہے پہاڑ سر کرنے کا۔افروز ! بھلااس سے کیا ملتا ہے ؟بس چوٹی پر پہنچ کر ایک اپنے ملک کا جھنڈا لگادینا۔“

”بس، یہ جنون ہی ہوتا ہے تمکین !اوراس سے جو ملتا ہے، وہ ایک کوہ پیما ہی بتا سکتا ہے، جسے اس کا جنون ہو۔“

اس رات نیلی سیاہی جیسی اُس کی رنگت بار باراُس کے تصور میں آتی رہی تھی اور وہ بہت دیر سے سوئی تھی۔

لیکن پھر بھی صبح وہ جلدی اٹھ گئی تھی کہ انہیں واپس روانہ ہونا تھا۔وہ پندرہ دن بعد ناران سے واپس جارہے تھے۔اور ہوٹل کالڑکا ہر روز ہی ان سے پوچھتا تھاکہ وہ کب واپس جائیں گے۔اوراب تو خاصی مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔کیونکہ زیادہ تر لوگ تین چار دن سے زیادہ نہیں ٹھہرتے تھے۔

شوگران میں انہوں نے ایک ہٹ لیا تھااور پروفیسر صفی اللہ نے بھی ذرافاصلے پر ہٹ لیا تھا۔

”کبھی شوگران کی چاندنی راتیں بہت مشہور تھیں اور یہاں چاندنی راتوں میں کوئی ہٹ خالی نہیں ہوتا تھا۔ تب یہ بڑاہوٹل یہاں نہیں تھا۔یہاں ہر جگہ پیلے پھول تھے۔جدھر زمین پر نگاہ جاتی تھی، پیلے پھولوں سے بھری ہوتی تھی۔اور چاندنی راتوں میں یوں لگتا تھا، جیسے زمین پر کسی نے سونا بکھیر دیا ہو۔“

لیکن اب صرف تھوڑی سی جگہ پر پیلے پھول نظر آرہے تھے۔ایک بڑاہوٹل تھا، جس کے سر سبز لان میں بچوں کے لئے جھولے لگے ہوئے تھے اور یہاں مختلف ہٹوں میں رہنے والوں کے بچے بھاگ دوڑ رہے تھے اور جھولوں سے لطف اٹھارہے تھے۔ہوٹل بہت خوب صورت تھا لیکن اس میں کھانا کھانے کا تجربہ کچھ اچھا نہیں تھا۔انہوں نے ایک پلیٹ شاشلک اور ایک پلیٹ فرنچ فرائز منگوائے تھے، جو تمکین کے پسندیدہ تھے۔

ایک ڈش کے سینٹر میں تھوڑے سے موٹے اُبلے ہوئے چاول، جن کی کوالٹی بالکل بھی اچھی نہیں تھی اور ذرا سی گریوی اور دو سیخیں جن میں غالباً چھوٹی چھوٹی دو بوٹیاں پروئی ہوئی تھیں۔یہی حال فرنچ فرائز کا تھا۔پلیٹ کے سینٹر میں چند ٹکڑے۔اور بل دیکھ کر تو تمکین حیران رہ گئی تھی۔

”یہ اتنے ذراسے کھانے اور دو پیپسی کا اتنا بل۔۔۔؟“

”تفریحی مقامات پر اسی طرح ہوتا ہے۔“

”لیکن ناران میں تو ایسا نہیں تھا۔“

اور پھر شوگران میں گھومتے ہوئے انہیں ایک تندور مل گیا، جہاں کچھ لوگ کھانا کھارہے تھے۔ گرم گرم تندوری روٹیوں کی خوشبو نے اس کی بھوک جگادی تھی۔چند نوالے چاولوں اور ذرا سے فرنچ فرائز سے بھوک کہاں مٹی تھی۔پھر مٹی کے تندور میں پکی گرم گرم روٹیوں کے ساتھ آلو کی بھجیا اور پکوڑے مزے لے لے کر کھائے تھے اور وہاں سے ہی چائے بھی پی تھی۔

پھر اگلے تین دن انہوں نے لنچ اور ڈنر اسی تندور ہوٹل میں کیا۔البتہ ناشتہ ہوٹل میں کرنا پڑتا تھا۔شوگران میں انہوں نے سولر پاور پلانٹ بھی دیکھا تھا۔

”ہزاروں روپے خرچ کر کے ایک وزیر صاحب کی آمد سے پہلے بنایا تھااور اب بے کار پڑا ہے۔“ پروفیسر صفی اللہ نے بتایا تھا۔

"مجھے اگر موقع ملا تو میں حکومتِ پاکستان کو اپنی تجاویز ضرور بھیجوں گا۔ میں نے جائزہ لیا ہے کہ یہاں کہاں کہاں چھوٹے چھوٹے بجلی گھر بنائے جا سکتے ہیں۔"

'لیکن پتہ نہیں، زندگی اسے موقع دے گی بھی یا نہیں۔' تمکین نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا۔ وہ ابھی تک گہری نیند میں تھا۔

'کیا افروز کو وہ سب کچھ کرنے کی اجازت ملے گی جو وہ سوچتا تھا؟' اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اپنا ہاتھ اس کے بازو سے ہٹا لیا۔

افروز رات بھر بہت بے چین رہا تھا۔ صبح کے قریب نرس نے اسے شاید کوئی لائٹ ساٹرانکولائزر دیا تھا۔ تبھی وہ اتنی گہری نیند میں تھا۔ ورنہ تو وہ آہٹ سے جاگ جاتا تھا۔ شوگران میں اسے پھر ٹمپریچر ہو گیا تھا۔ انہیں اس روز سری پائے جانا تھا لیکن انہوں نے واپسی کا پروگرام بنا لیا۔

"یوں بھی وہ کوئی ایسی خاص جگہ نہیں ہے۔" افروز نے بتایا تھا۔

واپسی پر وہ دو دن تسکین کے پاس ایبٹ آباد میں ٹھہرے تھے۔ تسکین اسے خوش دیکھ کر مطمئن ہو گئی تھیں۔

رات عقیل ملنے آیا تو افروز سے ہاتھ ملاتے ہوئے چونک پڑا۔

"ارے یار! تمہیں تو ٹمپریچر ہے۔"

"ہاں، پتہ نہیں کیا بات ہے۔ اکثر ہو جاتا ہے۔ ابھی پیناڈول لے لیتا ہوں۔ اتر جائے گا۔"

"لیکن یہ تو کوئی حل نہیں ہے یار! اس ٹمپریچر کا کوئی ریزن تو ہو گا۔ ویسے کب سے ہو رہا ہے؟"

"میں وہاں تھا، بوسٹن میں۔ تب سے ہو رہا ہے۔" افروز نے بتایا تھا۔

"اور تم نے چیک نہیں کروایا؟"

"بس، سستی۔ حالانکہ مجھے منتھلی چیک اپ کے لئے بھی جانا تھا۔ دو بار تاریخ گزر گئی اور جا ہی نہیں پایا۔"

"تو چلو، ڈاکٹر کی طرف چلتے ہیں۔ ڈاکٹر احسان اس وقت کلینک میں ہی ہوں گے۔"

"پلیز، میں اس وقت صرف اور صرف آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"اوکے۔ لیکن صبح ضرور ڈاکٹر کی طرف جانا ہے۔" عقیل اچھا خاصا وہمی تھا۔

VVV

لیکن پھر یوں ہوا کہ دوسرے دن ہی وہ پھلکوٹ چلے گئے تھے۔ آپا جان کا دو تین بار فون آیا تھا کہ اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور یہ کہ وہ بہت اُداس ہیں۔ افروز نے انہیں بھی سیل فون لے دیا تھا کہ رابطہ رہے۔

"افروز! آپ کو ڈاکٹر کی طرف جانا تھا۔ پتہ نہیں کیسا ٹمپریچر ہے۔ کہیں ملیریا یا ٹائیفائیڈ وغیرہ نہ بگڑا ہوا ہو۔"

"یار! پھر کسی دن آجائیں گے۔ اتنے دن ہو گئے ہیں گھر سے نکلے ہوئے اور پھر ان بے چاریوں کا بھی میرے سوا کون ہے۔ اُداس ہو جاتی ہیں۔"

پھر پھلکوٹ میں گزرے دو ماہ اور ان دو ماہ میں افروز نے کتنی محبت دی تھی اسے۔ کبھی کبھی تو وہ خوف زدہ ہو جاتی تھی۔

"ارے پگلی ہو تم۔۔۔ بھلا محبتوں کی شدت بھی کسی کو خوف زدہ کرتی ہے؟" افروز ہنسا تھا۔ ان دو ماہ میں کتنی ہی بار اس نے افروز سے کہا تھا کہ وہ ایبٹ آباد جا کر ایک بار پراپر چیک اپ کرا لے کیونکہ کئی بار اسے لگا تھا، جیسے افروز کو ٹمپریچر ہے لیکن وہ کہتا۔

"نہیں یار! ایسے ہی میرا جسم گرم ہے۔"

ان دو ماہ میں آپا اور اماں کا روّیہ کبھی تو بہت اچھا ہوتا۔ وہ اس پر واری صدقے ہوتی رہتیں اور یک دم روکھا سا ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ زیادہ پروا نہیں کرتی تھی۔ آپا کے میاں بھی اسے کچھ خاص اچھے نہیں لگے تھے۔ عجیب کھوجتی نظروں سے اسے دیکھتے تھے اور ان کی آنکھیں دیکھ کر کسی لومڑی کا خیال آتا تھا۔

VVV

اس روز وہ پورے دو ماہ بعد ایبٹ آباد آئے تھے۔ تسکین آپی سے ملنے۔ بوا نے بتایا تھا، ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہاں عقیل نے افروز کو خوب ڈانٹا۔

"تم نے اپنی حالت دیکھی ہے افروز! کتنے کمزور ہو رہے ہو۔ اور تمہیں احساس تک نہیں ہے۔ اس وقت بھی تمہیں بخار ہے۔"

"ہاں یار!۔۔۔ پچھلے کچھ دنوں سے بہت تھکن اور کمزوری محسوس ہوتی ہے۔" افروز نے اعتراف کیا۔
"سوچ رہا تھا، یہ بخار تو میری ہڈیوں میں ہی اتر گیا ہے۔ کسی دن ڈاکٹر کے پاس جانا ہی پڑے گا۔"

پھر عقیل اسے ڈاکٹر احسان کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر احسان نے بلڈ کے مختلف ٹیسٹ لکھ کر دیئے تھے۔ اور جب ٹیسٹ کی رپورٹ ملی تو ڈاکٹر احسان پریشان ہو گئے۔

"پلیز! آپ اسلام آباد یا لاہور جا کر مکمل چیک اپ کرائیں۔ مجھے شک ہے، کچھ اینیمیا ہے۔ اور Thrombocytopenia بھی ہو سکتا ہے۔"

پھر عقیل نے دو تین ڈاکٹرز سے رائے لی۔ سب کا خیال تھا کہ یہ بلڈ کینسر ہے اور سب نے ہی شوکت خانم جانے کا مشورہ دیا تھا۔ تاکہ کنفرم ہو جائے کہ ان کا شک صحیح ہے یا غلط۔

"میرا خیال ہے، وہ صحیح کہتے ہیں۔ میں بھلا اتنا خوش قسمت کہاں کہ۔۔۔۔"

"بکومت۔ مجھے یقین نہیں ہے۔" عقیل کو بھی تمکین کی طرح یقین نہیں آرہا تھا۔ اور پھر وہ زبردستی ضد کر کے افروز کو لاہور لایا تھا، جہاں بلڈ ٹیسٹ کے علاوہ بون میرو ٹیسٹ بھی ہوا اور تصدیق ہو گئی کہ بون میرو خراب خون پیدا کر رہا ہے۔

"اسے Leukeamia کہتے ہیں۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ "لیوکیمیا، بون میرو کے اندر ایک خاص خلیات سے متحرک ہوتا ہے اور وہ ایسے Blood Cells پیدا کرتا ہے، جن کی حرکات معمول کے مطابق نہیں ہوتیں اور صاف وصحت مند خون کے بجائے کینسر زدہ خون کی پیداوار ہونے لگتی ہے اور بون میرو تباہ ہو جاتا ہے۔"

"کوئی اُمید، کوئی علاج تو ہو گا نا۔۔۔؟"

"یوں تو بلڈ کینسر کا مطلب ہے، یقینی موت۔ لیکن بروقت شناخت ہو جائے تو آج کل ایسے مریضوں کا علاج Immuno Theropy کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ اس کا علاج کیمو تھراپی بھی ہے لیکن اس کے بعد بال غائب ہونے لگتے ہیں اور مریض کو چکر یا غنودگی کی شکایت ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی انفیکشن ہو جاتا ہے، جس سے خون میں سفید خلیے پیدا ہونے کم ہو جاتے ہیں۔ لیکن Immuno Theropy سے بال جھڑنے وغیرہ کی شکایت نہیں ہوتی اور آج کل ہم کیمو تھراپی اور Immuno Theropy کے کمبی نیشن سے علاج کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر نے انہیں پوری تفصیل سے بتایا تھا اور فوری طور پر علاج شروع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

"بلڈ کینسر کا دوسرا نام موت ہے۔ یقینی موت۔۔۔!" افروز نے واپس آکر تمکین کو بتایا تو وہ بے یقینی سے اُسے دیکھنے لگی۔

"نہیں۔۔۔" بڑی دیر بعد اس کے لبوں سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی تھی۔ "نہیں۔۔۔" اُس کے لبوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی اور وہ بیٹھتی چلی گئی۔

"ایسا ہی ہے تمکین!" اس نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔ "کاش، میں چند ماہ پہلے جان جاتا تو تمہیں۔۔۔۔ سوری تمکین! میں نے انجانے میں تمہارے ساتھ زیادتی کر دی۔"

افروز نے اور بھی کچھ کہنا تھا لیکن وہ تو یونہی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تو کیا میری خوشیوں اور محبتوں کی عمر بس اتنی ہی تھی؟"

"نہیں۔۔۔" اُس نے پھر کہا۔ اُس کے لبوں کو جنبش تو ہوئی تھی لیکن آواز باہر نہیں نکلی تھی۔

"دنیا میں اتنی ترقی ہو رہی ہے۔ کلوننگ تک کر لی ہے انسان نے، تو کیا اس مرض کا علاج نہیں ہو گا؟" اُس نے پُرامید نظروں سے عقیل کی طرف دیکھا، جو سر جھکائے بیٹھا تھا، پھر تسکین کی طرف جو اپنی وہیل چیئر کے ہتھے پر ہاتھ رکھے اُسی کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔

"ڈاکٹر کہتا ہے کہ کیمو تھراپی اور Immuno Theropy کے کمبی نیشن سے علاج ممکن ہے۔"

تمکین کی آنکھوں میں یکا یک چمک سی نمودار ہوئی تھی۔

''تو پھر آپ یہاں کیوں آئے؟ علاج کیوں نہیں شروع کروایا؟'' اس کی آواز یک دم اونچی ہو گئی تھی۔ ''آپ کو آنا ہی نہیں چاہیئے تھا۔''

''کوئی فائدہ نہیں تمکین! یہ محض دل کے بہلاوے ہیں۔ موت اور یقینی موت۔ اور میں ہسپتال میں جھڑے ہوئے بالوں اور اذیت سہتے ہوئے نہیں مرنا چاہتا۔ میں اپنے بیڈ روم کی کھڑکی سے سامنے

برف پوش پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے تمہاری۔۔۔۔''

''فضول باتیں مت کریں افروز! کیا لوگ بیمار نہیں ہوتے؟ کیا وہ علاج نہیں کراتے؟'' اُسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ افروز اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا تھا، اس لئے خاموش ہو گیا تھا۔ تحسین نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''ریلیکس تمکین!''

''آپی۔۔۔۔!'' وہ اُن کے گھٹنے پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

تسکین نے اُسے رونے دیا اور ہولے ہولے اسے تھپکنے لگیں۔ خود ان کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں اور وہ بہت مشکل سے ضبط کر رہی تھیں۔ افروز تو بچپن میں بھی انہیں بہت عزیز تھا۔ بالکل چھوٹے بھائیوں کی طرح لگتا تھا۔ اور اب تو تمکین کے حوالے سے اور بھی پیارا ہو گیا تھا۔

''کبھی کبھی معجزہ بھی تو ہو جاتا ہے۔ تم علاج شروع کرو تو شاید۔۔۔۔'' تسکین نے بھی اسے سمجھایا تھا۔

''معجزے ہم جیسے انسانوں کے ساتھ نہیں ہوتے آپی!'' افروز بہت مایوس تھا۔ اور وہ عقیل اور تسکین کے روکنے کے باوجود پھلکوٹ واپس آ گیا تھا۔ تمکین نے محسوس کیا تھا کہ آپا اور اماں کو یہ جان کر کوئی خاص دکھ نہیں ہوا تھا۔ گو انہوں نے افسوس کا اظہار کیا تھا لیکن ان کے لفظ سطحی سے لگے تھے اسے۔

'اگر بابا زندہ ہوتے یا افروز کی اپنی سگی ماں ہوتی تو کیا اتنے ہی سکون سے یہ خبر سنتیں؟' تمکین نے سوچا تھا۔
ان دس بارہ دنوں میں سینکڑوں بار آپا نے جتایا تھا کہ بلڈ کینسر کتنا موذی مرض ہے اور اس کا مریض کبھی نہیں بچتا۔ وہ چڑتی تو افروز عجیب ادا سے مسکراتا۔

''سچ ہی تو کہتی ہیں آپا۔''

''غلط کہتی ہیں۔'' وہ بحث کرتی۔

''ہم علاج کے لئے باہر بھی جا سکتے ہیں۔'' وہ اسے قائل کرنے کی کوشش کرتی۔

''یہاں بھی بڑے کوالیفائیڈ ڈاکٹر ہیں۔ لیکن جب علاج ہی نہیں تو۔۔۔۔'' وہ از حد مایوس تھا۔

ان دس بارہ دنوں میں مختلف اوقات میں اس پر مختلف کیفیات طاری ہوتی رہیں۔ کبھی تو بالکل خاموش، بیڈ پر لیٹا کچھ سوچتا رہتا۔ کبھی اس کا جی چاہتا کہ تمکین ایک لمحے کے لئے بھی اس کی نظروں کے

سامنے سے نہ ہٹے۔اور کبھی وہ تمکین کے ساتھ باہر نکل جاتا اور گھنٹوں وہ کسی ٹیلے پر بیٹھے رہتے تھے۔

’’چلو تمکین!ایک بار پھر ناران چلتے ہیں۔‘‘

’’چلیں گے۔لیکن پہلے لاہور چلیں۔میرے لئے،میری خاطر۔‘‘

اور تب وہ تیار ہو گیا۔

’’ٹھیک ہے،چلتا ہوں۔تاکہ بعد میں یہ نہ کہو کہ تمہاری بات نہیں مانی تھی۔تمکین!کاش۔۔۔کاش میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہارے لئے،تمہاری خاطر اللہ سے اپنی زندگی مانگ لیتا۔۔۔لیکن۔۔۔‘‘

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونکی۔افروز ابھی تک سو رہا تھا۔عقیل تھا۔

’’السلام علیکم!رات کیسی طبیعت رہی؟‘‘

’’بہت بے چین رہے ہیں رات بھر۔بار بار کہتے تھے،عقیل کو بلاؤ۔مجھے گھر جانا ہے۔‘‘

’’تھراپی کے بعد گھبراہٹ اور بے چینی تو بہت ہوتی ہے۔حالانکہ آج تو اتنے دن بعد۔۔۔ختم ہو جانی چاہئے تھی یہ گھبراہٹ۔‘‘ عقیل دروازے کے ساتھ لگے صوفے پر بیٹھ گیا۔

تبھی افروز نے کروٹ بدلی اور آنکھیں کھول کر عقیل کو دیکھا۔

’’ہم گھر کب جائیں گے عقیل؟‘‘

’’آج ہی کسی ٹائم۔‘‘ وہ کہنیاں ٹیک کر اٹھنے لگا تو تمکین نے اسے سہارا دیا۔

’’آج تو تم بہتر لگ رہے ہو۔‘‘ عقیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’یہ سب وقتی ہے عقیل!تم جانتے ہو،بالآخر ایک دن۔۔۔اور یہ تھراپی کی اذیت اور تکلیف میں صرف تمکین کی خاطر،اس کی تسلی کے لئے برداشت کر رہا ہوں۔ورنہ میں جانتا ہوں کہ۔۔۔‘‘

’’خدا کے لئے۔۔۔خدا کے لئے افروز!اتنی مایوسی کی باتیں نہ کیا کریں۔کیوں ہیں آپ اتنے مایوس؟۔۔۔کیوں نہیں آپ اُمید پیدا کرتے اپنے اندر؟‘‘ تمکین یک دم جذباتی ہو کر کھڑی ہو گئی۔

وہ بے بسی سے مسکرا دیا۔

’’تمکین!یہ طفل تسلیاں ہیں ڈاکٹروں کی اور لاحاصل کوششیں۔تمہیں یاد نہیں کہ آپا نے۔۔۔‘‘

’آپا کی تو عادت ہے افروز!چن چن کر مجھے اذیت دینے کے لئے۔‘‘ یکایک اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ لڑکھڑائی۔عقیل نے بے اختیار اٹھ کر اسے سہارا دیا۔

’’کیا ہوا؟۔۔۔کیا ہوا تمو؟‘‘

افروز بے قراری سے پوچھ رہا تھا۔اور وہ سر تھامے بیٹھی تھی۔تبھی نرس دستک دے کر کمرے میں آئی۔

’’کیسے ہیں افروز صاحب۔۔۔؟‘‘

’’وہ۔۔۔تمو۔۔۔تمکین۔۔۔سسٹر!پلیز،انہیں چیک کریں۔شاید بی پی۔۔۔یک دم لو ہو گیا ہے۔‘‘

وہ پریشانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا مسز افروز؟'' نرس نے ہاتھ میں اٹھائی ٹرے ٹیبل پر رکھی۔

''یونہی چکر آگیا تھا۔''

''چلیں پھر، بی پی چیک کرتے ہیں۔'' نرس نے بی پی چیک کیا۔

''کیوں۔۔۔؟'' افروز نے بے چینی سے پوچھا۔

''فکر کی کوئی بات نہیں۔ ویسے ابھی کچھ دیر بعد ڈاکٹر اسما آئیں گی۔ آپ ان سے مکمل چیک اپ کروالیں۔''

تمکین نہیں جانا چاہتی تھی، لیکن افروز نے ضد کرکے بھیجا۔

ڈاکٹر اسما نے خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ تاہم یورین بھی ٹیسٹ کرتے ہیں۔ اور پھر انہوں نے تصدیق کردی۔

وہ حیران سی کھڑی تھی۔ یہ خوشخبری کس وقت اور کس جگہ ملی تھی؟ اور پتہ نہیں، افروز کا کیا ردِ عمل ہوگا۔ وہ سوچتی ہوئی کمرے میں آئی تھی۔ افروز پاؤں لٹکائے بیڈ پر بیٹھا تھا اور عقیل سامان اکٹھا کررہا تھا۔

''کیا ڈاکٹر سے بات ہوگئی ہے عقیل بھائی؟''

''ہاں۔ ڈاکٹر نے جانے کی اجازت دے دی ہے۔ لیکن تاکید کی ہے کہ دوسری تھراپی سے پہلے کے وقفے میں بھی چیک اپ کراتے رہیں۔''

''افروز! ہم یہاں ہی آپ کے ماڈل ٹاؤن والے گھر میں ہی نہ رہ جائیں؟ وہاں پھلکوٹ میں تو ڈاکٹر بھی نہیں ملتا۔ اور پھر اگر کبھی اچانک طبیعت خراب ہو جائے تو یہاں لاہور میں ہوں گے تو ہسپتال میں فوراً آیا جاسکتا ہے۔''

''فی الحال تو ہمیں واپس جانا ہے، تمکین! پھر سوچیں گے۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔ ''اور تم نے بتایا نہیں کہ ڈاکٹر نے کیا کہا ہے۔ چکر کیوں آیا ہے؟ طاقت کی کچھ دوائیں دی ہیں؟ میرے ساتھ یہاں ہسپتال میں خوار ہو رہی ہو، اپنی صحت کا خیال ہی نہیں ہے تمہیں۔''

وہ تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جبکہ عقیل ہسپتال کے ڈیوز دینے کے لئے باہر نکل گیا تھا۔ تمکین کا چہرہ یک دم گل رنگ ہوگیا تھا۔ اندر کہیں گدگدی سی ہوئی تھی۔ کیسا خوش کن سا احساس تھا۔ وہ بھی ماں کے عظیم رتبے پر فائز ہونے والی تھی۔

''تمکین۔۔۔!'' اُسے خاموش دیکھ کر اس نے بے قراری سے اسے پکارا۔

''وہ میں۔۔۔'' اُس نے بہ مشکل پلکیں اٹھائی تھیں۔ ''افروز! ہم۔۔۔ مم۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ۔۔۔ باپ۔۔۔''

ایک دم افروز کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ وہ بے اختیار کھڑا ہوگیا تھا۔ لیکن پھر اس کی آنکھیں بجھ گئیں اور رنگت پھیکی پڑگئی۔

"اور کتنا بدنصیب ہے یہ بچہ۔ جب دنیا میں آئے گا تو اسے دیکھنے کے لئے اس کا باپ زندہ نہیں ہو گا۔"

"افروز!" تمکین نے بے حد ناراضی سے اسے دیکھا۔ "کیوں ستاتے ہیں آپ مجھے؟ کیوں کرتے ہیں ایسی باتیں؟۔۔۔بچے کا باپ اسے دیکھے گا، اسے انگلی پکڑ کر سکول لے جائے گا۔"

تمکین کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ یکایک اُس نے بات ادھوری چھوڑ کر افروز کے ہاتھ تھام لئے۔

"افروز! اس بچے کی خاطر اپنے اندر زندگی کی خواہش پیدا کریں۔ مایوسی کو ختم کریں گے تو ہی ہمت کے ساتھ اس موذی مرض کا مقابلہ کر سکیں گے۔ یہ بچہ افروز۔۔۔" اُس کے آنسو اُس کے رخساروں پر پھسل آئے تھے۔

"او کے۔۔۔" لمحہ بھر بعد افروز مسکرایا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ "اس طرح مت رویا کرو پلیز۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ اور پرامس، میں اس بچے کی خاطر موت سے اپنی آخری سانس تک لڑوں گا اور۔۔۔ اور اسے شکست دے دوں گا۔"

"ان شاءاللہ!" تمکین نے کہا اور اتنے عرصے میں پہلی بار تمکین کو اس کی آنکھوں میں مایوسی کے بجائے اُمید کی لو دمکتی نظر آئی اور اس کے اندر دور تک اطمینان پھیلتا چلا گیا۔

VVV

فروری کی آخری شام بے حد اُداس کر دینے والی تھی۔

تمکین نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر باہر دیکھا، سورج آہستہ آہستہ پہاڑوں کے پیچھے ڈوب رہا تھا۔ وہ اکثر اپنی کھڑکی سے سورج کو ہولے ہولے پہاڑوں کے پیچھے ڈوبتے دیکھتی تھی۔ اگرچہ یہ منظر ہمیشہ اُداس کر دینے والا ہوتا تھا۔ ایک گہری اُداسی ہولے ہولے اُس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی لیکن وہ اندھیرے کو آہستہ آہستہ پوری وادی کو اپنی لپیٹ میں لیتے دیکھتی رہتی تھی۔ ابھی تک اندھیرا نہیں ہوا تھا اور دور برف سے ڈھکے پہاڑوں پر سرمئی دُھند چھائی لگتی تھی۔

وہ کچھ دیر یونہی جنگلے پر کہنیاں ٹکائے سفید پوش پہاڑوں کو سرمئی لبادہ اوڑھے دیکھتی رہی،، پھر یک دم سیدھے ہوتے ہوئے اس نے ذرا سا رخ موڑ کر سامنے دیکھا اور غیر ارادی طور پر اُس کی نظریں اس سڑک سے پار ریسٹ ہاؤس کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کے سامنے اپنے ٹیرس پر وہ کھڑا اِدھر ہی دیکھ رہا تھا اور اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے ہاتھ ہلایا تو وہ یک دم گھبرا کر کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ کتنی ہی دیر تک اُس کا دل زور زور سے دھڑکتا رہا۔ اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے سائیڈ ٹیبل سے گلاس اٹھا کر دو گھونٹ پانی کے بھرے اور پھر گلاس ٹیبل پر رکھ دیا۔ ابھی تک اس کا دل معمول سے زیادہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ یہ شخص وہاں اپنے ٹیرس پر کھڑا اسے کیوں دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے ہاتھ کیوں ہلایا تھا؟

یہ شخص پچھلے دس دن سے اس کے اعصاب پر چھایا ہوا تھا۔ اگرچہ اس روز کے بعد اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، پھر بھی غیر ارادی طور پر وہ بیتے دس دنوں میں اسی کے متعلق سوچتی رہتی تھی۔ وہ اس کی ممنون تھی کہ اس نے اس کی مدد کی تھی اور اپنی جیپ میں اسے گھر چھوڑ گیا تھا۔ لیکن آپا نے اس کے دل میں وہم ڈال دیا تھا۔ اُسی شام وہ اوپر اس کے بیڈ روم میں آئی تھیں۔

''کیسی ہو؟'' وہ اُس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں۔ اس وقت ان کا موڈ بہت اچھا تھا۔ ان کی یہ دھوپ چھائوں والی کیفیت ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

''لو۔۔۔ صبح تم سے پوچھا ہی نہیں کہ کیسے موچ آگئی۔ سچی بات تو یہ ہے بی بی! کہ جب تک چائے نہ ملے مجھے، تو میں ٹینشن میں ہی رہتی ہوں۔ اور یہ لندن بی بی کمبخت کبھی کبھی تو بہت ہی زچ کرتی ہے۔''

تمکین کو پہلی بار لندن بی بی کا نام سن کر بہت ہنسی آئی تھی۔

''یہ لندن بی بی ہے، دلبر کی والدہ۔۔۔!'' آپا نے تعارف کروایا تھا۔

''یہ کیا نام ہوا بھلا؟'' اس نے سرخ و سپید رنگت والی اس عورت کو دیکھا۔

''بس جی، ہمارے بابا نے ہمارا یہی نام رکھا تھا۔ وہ کہتا تھا، ہمارا بیٹی شہر لندن کی طرح خوب صورت ہے۔''

لندن بی بی مزاج کی اچھی اور ہنس مکھ سی تھی اور وہ تمکین کا بہت خیال کرتی تھی۔

''ہاں، تو بولو کیا ہوا تھا؟ اور کیسے گر گئیں؟'' شہر بانو اُسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ تب تمکین نے ساری بات بتا دی۔

''ہوں۔۔۔۔ مجھے تو یہ شخص۔۔۔۔ کیا نام بتایا تھا اُس کا دلبر نے، دانیال مرزا۔۔۔۔ مشکوک لگتا ہے۔ کیا خبر یہی وہ ہو۔۔۔۔ میرا مطلب ہے وہ لوئی والا آدمی۔ اور پھر لوئی پھینک کر تمہارا ہمدرد بن کر آ گیا۔''

''ہو سکتا ہے۔'' اس نے بھی سوچا تھا۔

''اور یوں بھی اجنبی ہے۔ جانے کس مقصد سے اس سرد موسم میں یہاں آکر رہ رہا ہے۔ بھئی محتاط رہنا اس سے۔ اور پھر تمہیں اس حالت میں باہر نکل کر پتھروں پر دوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو؟'' وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

کتنی غلطی ہوئی تھی اس سے کہ وہ یوں تنہا صبح صبح باہر نکل گئی تھی۔ آئندہ وہ اکیلی ایسے وقت میں باہر نہیں نکلے گی، جب باہر ویرانی ہو۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کیا تھا۔۔۔۔ اُسے اپنا خیال رکھنا تھا۔ اس کے لئے جو ابھی دنیا میں نہیں آیا تھا۔ اور افروز نے کتنی تاکید کی تھی کہ وہ اپنا خیال خود رکھے گی۔

''ٹھیک ہے آپا!۔۔۔۔ آئندہ احتیاط کروں گی۔''

''تمہاری ہی بہتری کے لئے کہہ رہی ہوں، بی بی!'' وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ ''کھانا کھانے تو تم نیچے نہ آسکو گی، میں لندن بی بی کے ساتھ اوپر ہی بھجوا دوں گی۔''

"جی، شکریہ آپا!"

"اور ہاں۔۔۔ میں نے تو سوچا تھا کہ کل تمہارے بھائی صاحب آئیں گے تو تم ایبٹ آباد چلی جاتیں ان کے ساتھ۔ لندن بی بی ساتھ چلی جاتی تمہارے اور چیک اپ کروالیتیں۔ لیکن تم تو پاؤں تڑوا کر بیٹھ گئیں۔"

"کوئی بات نہیں آپا! ایسی کوئی تکلیف تو ہے نہیں مجھے۔ پھر کسی روز چلی جاؤں گی۔"

وہ اُن کے اندازِ گفتگو کی عادی ہوگئی تھی اب۔ اور ان کے جانے کے بعد کئی بار اس نے سوچا۔ 'تو کیا وہ شخص ۔۔۔ لیکن بھلا اسے مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ مگر اور بھی کسی کو بھلا مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟' ذہن اُلجھ سا گیا تھا لیکن اُس نے اس کا خیال ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

دو تین روز بعد اس کا پاؤں بھی ٹھیک ہو گیا تھا۔ گو زیادہ چلنے سے ہلکا درد ہوتا تھا لیکن اب وہ سارے گھر میں گھومتی پھر رہی تھی۔ تین روز بعد وہ کچن میں آئی تھی۔ دلبر برتن کپڑے سے خشک کر کے رکھ رہا تھا۔

"بی بی جی! وہ ڈاک بنگلے والا صاحب آپ کا حال پوچھ رہا تھا۔ میں نے بتا دیا تھا، ابھی ہمارا بی بی صاحب کا پاؤں میں تھوڑا ورم ہے۔ وہ کہہ رہا تھا، ایک بار پھر گل لالہ کو دکھا دینا۔"

وہ حیران سی دلبر کو دیکھنے لگی تھی۔

"تم۔۔۔ تمہیں کہاں ملا تھا وہ؟"

"وہ جی، میں مامے کی طرف گیا تھا نا۔ اُس کو بخار تھا۔ اماں تو اُدھر مامے کی طرف نہیں جاتی۔ ہمارا باپ نے قسم دیا ہوا تھا اماں کو کہ وہ کبھی مامے سے نہیں ملے گی۔ تو اماں نے بھیجا تھا اُدھر، حال پتہ کرنے۔" وہ گھبرا کر تیز تیز بولنے لگا تھا۔

"اوہ۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے ساس پین میں چائے کا پانی رکھا اور غیر ارادی طور پر اس کے متعلق سوچنے لگی۔

'وہ شخص برا نہیں لگتا تھا۔ اگر وہی شخص لوئی والا ہوتا تو میرا احوال نہ پوچھتا اور نہ ہی گل لالہ کی طرف جانے کا مشورہ دیتا۔'

چائے بناتے ہوئے وہ جیسے اس اُلجھن سے خود کو آزاد کر چکی تھی، جو پچھلے تین دنوں سے اس کے دماغ کو پریشان کئے ہوئے تھی۔

چائے کا کپ لے کر وہ اوپر اپنے کمرے میں آگئی تھی اور پھر یونہی کپ ہاتھ میں لئے لئے وہ ٹیرس پر آگئی تھی۔

ریسٹ ہاؤس کا ٹیرس ویران تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑی چائے کے چھوٹے چھوٹے سپ لیتی رہی اور پھر واپس کمرے میں آگئی۔ تقریباً پورا ہفتہ اس نے ارادی اور غیر ارادی طور پر سامنے ٹیرس کو دیکھا تھا لیکن وہ نظر نہیں آیا تھا۔ ٹیرس کی طرف کھلنے والا کمرے کا دروازہ بھی بند تھا۔

'شاید وہ واپس چلا گیا ہے۔ اتنے سخت ٹھنڈے موسم میں بھلا میدانی علاقوں کے لوگ کہاں رہ سکتے ہیں۔ ایڈونچر کا شوق ختم ہو گیا ہو گا۔'

اُس نے خود ہی سوچ لیا تھا۔ لیکن آج یک دم اُسے اچانک ٹیرس پر دیکھ کر پتہ نہیں وہ کیوں گھبرا گئی تھی۔ ایک دم ہی اس پر خوف سا طاری ہو گیا تھا۔

'پتہ نہیں کون ہے۔ اور کہیں آپا کا خیال سچ ہی نہ ہو۔ کیا پتہ اُسے کہیں سے سن گن مل گئی ہو کہ یہاں اس چھوٹے سے کاٹیج میں ہم صرف تین عورتیں ہی ہیں اور بھائی صاحب تو کبھی کبھار ہی آتے ہیں اور وہ لوٹنا چاہتا ہو۔ میرا خیال ہے کہ میں عقیل بھائی سے کہہ کر اپنا زیور لاکر میں رکھوا دوں۔'

آپی نے اسے اچھا خاصا زیور دیا تھا۔ گو یہ زیور پرانا تھا لیکن بہت بھاری تھا۔ اُس کی اماں کی شادی کا بہت ہی یونیک قسم کا زیور۔۔۔۔ تسکین نے کہا بھی تھا کہ اگر وہ چاہے تو گلو بند یا کوئی اور زیور دے کر جدید زمانے کا زیور بنا لے لیکن اسے یہ سب زیور بہت پسند تھا۔ یوں بھی افروز کی طرف سے سب زیور جدید ہی تھا اور وہ پچھلے دس دن سے مسلسل ہی سوچتی رہی تھی کہ وہ نظر آئے تو ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کر دے۔ اب اسے دیکھ کر پریشان سی ہو گئی تھی۔

'پتہ نہیں، وہ ابھی تک ٹیرس پر ہی کھڑا ہے یا پھر کمرے میں واپس چلا گیا ہے۔' اُس نے سوچا اور ایک بار پھر دروازہ کھول کر سامنے ریسٹ ہاؤس کے ٹیرس کو دیکھا۔ ٹیرس خالی تھا۔ لیکن کمرے کا

دروازہ کھلا تھا اور ٹیرس کے جنگلے پر اُس کا تولیہ لٹکا ہوا تھا۔ وہ واپس کمرے میں آگئی۔ وہ ایک بار پھر اس کے متعلق سوچنے لگی تھی۔ تب ہی دلبر دستک دے کر کمرے میں آگیا۔

"بی بی جی کہہ رہی ہیں، صاحب جی ایبٹ آباد جا رہے ہیں کسی کام سے۔ آپ نے چلنا ہے تو تیار ہو کر نیچے آ جائیں۔"

"نہیں۔۔۔۔ مجھے ابھی نہیں جانا۔"

اُسے یک دم گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ اُسے شہر بانو کے میاں سے بہت خوف آتا تھا۔ عجیب سی نظروں سے وہ اسے دیکھتا تھا اور اس کی آنکھیں۔۔۔۔ چھوٹی چھوٹی، سرخی مائل آنکھیں کسی مکار لومڑی کی طرح لگتی تھیں اسے۔۔۔۔ کچھ ہی دیر بعد وہ شہر بانو تیز تیز چلتی ہوئی اس کے کمرے میں آگئیں۔

"لو۔۔۔۔ میں نے کیا کہا تھا تمہیں۔ نادر خان کے ساتھ ایبٹ آباد جا کر چیک اپ کرا آئو۔"

"آپا! میں ابھی اس کی ضرورت نہیں سمجھتی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور مجھے کوئی پرابلم نہیں ہے۔" اس نے آہستگی سے لیکن مضبوط لہجے میں کہا۔

"ارے تم کل کی بچی، تم کیا سمجھو۔ میں کہہ رہی ہوں چلو اُٹھو، کپڑے بدلو۔ شام تک نادر خان واپس آجائے گا۔"

"نہیں آپا! مجھے نہیں جانا۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

شہر بانو نے ایک غصیلی نظر اس پر ڈالی اور بڑبڑاتی ہوئی زور سے دروازہ بند کرتی واپس چلی گئیں۔

VVV

"تمکین! نادر بھائی بہت لالچی اور حریص ہیں۔اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے بعد وہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔۔۔ان سے محتاط رہنا۔" افروز نے کہا تھا۔

"افروز!" اُس نے سسکی لی تھی۔"مجھے اس وقت،اس لمحے تمہارے ساتھ کی کتنی ضرورت ہے۔۔۔اور کتنی دعائیں کی تھیں میں نے کہ جب وہ اس دنیا میں آنکھ کھولے تو آپ میرے ساتھ ہوں۔لیکن جو لکھا جا چکا تھا اسے تو۔۔۔بدلا نہیں جا سکتا تھا۔"

"میں مرنا نہیں چاہتا تمکین! میں تمہارے سنگ جینا چاہتا ہوں۔اس کو وجود میں آتے دیکھنے کی خواہش ہے مجھے۔میں اس کے لمس کو محسوس کرنا۔۔۔اس کی انگلی پکڑ کر اس کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔"

زندگی کی۔۔۔جینے کی کیسی اُمنگ جاگ اُٹھی تھی افروز میں۔وہ،جو مایوس ہو چکا تھا،اب اُسے پانے کی تگ و دو کرنا چاہتا تھا۔ہر وہ علاج آزمانا چاہتا تھا،جس سے زندگی کا امکان روشن ہوتا۔چاہے وہ کیمو تھراپی ہو یا ٹرانسپلانٹیشن۔

"ہم امریکہ چلتے ہیں۔"

لاہور سے آنے کے دو دن بعد ابھی جب وہ ایبٹ آباد میں ہی تھے تو اس نے کہا۔افروز اور تسکین نے اس کی تائید کی تھی۔پھر ایک ہفتے بعد ہی اس نے اپنی سیٹ کنفرم کروالی تھی۔

"لیکن آپ اکیلے افروز۔۔۔!" تمکین رو پڑی تھی۔

"تمو! میں اب ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا۔دیر ہو گئی تو۔۔۔میں نے عقیل کو سمجھا دیا ہے،تمہارے ویزے کے لئے اپلائی کر دے گا وہ۔اور میں بھی پیپر جمع کروا دوں گا،وہاں جاتے ہی۔اور تم پریشان مت ہونا تمکین! وہاں میرے بہت دوست ہیں۔افضل انکل ہیں۔لیکن مجھے جانا ہے،تمہارے لئے۔اور اس کے لئے جس کی آمد کی نوید نے میرے اندر زندہ رہنے کی خواہش پیدا کر دی ہے۔"

وہ اُس کا ہاتھ تھامے یوں ہی آنسو بہاتی رہی تھی۔

"دیکھو،تم نے رونا نہیں ہے اور میرے لئے دعا کرنی ہے۔اور اس دوران یہاں ہی رہنا،آپی کے پاس۔یوں بھی ڈاکٹر نے تمہیں ریسٹ کے لئے کہا ہے۔زیادہ سے زیادہ ایک ماہ تک تمہارا وزٹ ویزا مل جائے گا۔میری بیماری کی وجہ سے شاید کچھ جلدی مل جائے۔یہ بھی ہو سکتا ہے،ایک ماہ سے زیادہ لگ جائے۔لیکن تم بہت جلد میرے پاس ہو گی،وہاں۔اور پھر ہم وہاں ہی رہیں گے جب تک میرا علاج ہوتا رہے گا۔"

جانے سے ایک روز پہلے عقیل اپنے ساتھ اس کے وکیل کو لایا تھا۔اور پھر کتنی ہی دیر تک وہ اور عقیل،وکیل کے ساتھ ڈسکس کرتے رہے تھے۔اور جب وکیل کے جانے کے بعد وہ کمرے میں آیا تو بے حد تھکا تھکا سا تھا۔

"تمو! یقین نہیں آتا۔۔۔ بالکل بھی یقین نہیں آتا کہ دنیا میں اتنا دھوکا اور فریب بھی ہے۔" وہ بے حد دکھی ہو رہا تھا۔

"آپا کے میاں نادر خان نے بابا کے اور میرے جعلی دستخطوں سے بے شمار اراضی فروخت کر ڈالی ہے، اور کیا کہوں۔۔۔ آکر بات کروں گا آپا سے اور اماں سے۔ یقیناً وہ بھائی صاحب کے اس کارنامے سے بے خبر ہوں گی۔"

اور پھر وہ چلا گیا۔

تمکین کو لگا تھا جیسے وہ یک دم تنہا اور اکیلی ہو گئی ہے۔۔۔ یہی وہ گھر تھا، جہاں آپی اور بوا کے ساتھ رہتے ہوئے اسے کبھی اکیلے پن کا احساس نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب اسی گھر میں وہ بولائی بولائی سی پھرتی تھی۔ فون پر وہ ہر دوسرے تیسرے دن بات کرتا تھا، لیکن اس کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ اُڑ کر وہاں پہنچ جاتی۔

"افروز! یہاں بھی تو بڑے کوالیفائیڈ ڈاکٹر ہیں، پلیز واپس آجائو۔"

"ہاں تمکین! لیکن یہاں مجھے زیادہ سہولتیں میسر ہیں۔ اور تم پریشان نہ ہو۔ میں کوشش کر رہا ہوں۔ بہت جلد تم آسکو گی۔"

لیکن صرف اٹھائیس دنوں بعد وہ تسکین آپی کے سامنے کھڑا تھا۔ نڈھال اور تھکا تھکا سا۔ اُس کی رنگت سیاہ ہو رہی تھی، آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے اور سر کے بال سامنے سے جھڑ گئے تھے۔ صرف اٹھائیس دنوں میں۔ تمکین ساکت سی کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

"افروز!۔۔۔ افروز۔۔۔!" اُس کے لب ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ "یہ۔۔۔ آپ۔۔۔ اچانک۔۔۔"

"ہاں۔۔۔" اُس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ "میں نے تو بہت چاہا تمکین کہ۔۔۔" وہ نڈھال سا صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

"اور اگر مجھے علم ہوتا کہ میرے جانے کا کوئی فائدہ نہیں تو میں کبھی بھی نہ جاتا۔۔۔ میں ہر لمحہ۔۔۔" اور پھر وہ تسکین اور سر جھکائے کھڑے عقیل کو دیکھ کر خاموش ہو گیا تھا۔

"وہ مجھے آنے نہیں دے رہے تھے، لیکن میں نے جان لیا تھا۔ مجھے ادراک ہو گیا تھا کہ اب کوئی فائدہ نہیں۔ اور جب میں نے جان لیا تو میں نے ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کی۔۔۔ حالانکہ وہ سب ناراض ہو گئے۔ انکل افضل اور میرے دوست۔۔۔ مگر جو میں جانتا تھا، وہ نہیں جانتے تھے۔"

عقیل نے اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے ہولے سے اُس کا ہاتھ دبایا تھا۔ تمکین ابھی تک ساکت کھڑی تھی۔

"بیٹھ جائو نا تمکین!" اسی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے ایک حسرت بھری نظر اس پر ڈالی اور وہ کسی روبوٹ کی طرح تسکین کی وہیل چیئر کے قریب پڑے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

”پتہ نہیں کیا ہوا تھا اور کیوں۔ لیکن بہت جلدی ہو گیا سب۔۔۔۔ انفیکشن اتنا زیادہ تھا کہ کنٹرول نہیں ہو پا رہا تھا۔ سفید ذرّات خون میں تیزی سے ختم ہو رہے تھے۔ ایک دن پتہ چلتا، سفید ذرات کی تعداد کچھ بڑھی ہے لیکن اگلے روز پھر دو بار بلڈ بھی لگا۔۔۔۔ اور یہ قدرت کا فیصلہ ہے تمکین!“

تمکین کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ لیکن شدتِ غم سے آنسو خشک ہو گئے تھے۔

”عقیل! کل صبح ہمیں پھلکوٹ چھوڑ آنا، یار!“

”لیکن میرا خیال ہے، ہمیں لاہور چلنا چاہئے۔۔۔۔ تم اپنے گھر رہو۔ وہاں ڈاکٹرز۔۔۔۔“

”پلیز، عقیل! میں جو کہہ رہا ہوں، وہی کرو۔“ اس کا لہجہ حتمی تھا۔

اور پھر پندرہ دن وہ پھلکوٹ میں رہے تھے۔ گھنٹوں وہ یہاں ٹیرس پر کھڑے سامنے پہاڑوں کو دیکھتے رہتے تھے۔ ان پندرہ دنوں میں افروز نے بہت زیادہ باتیں نہیں کی تھیں۔ کبھی کبھی اس کی طبیعت بہت خراب بھی ہو جاتی تھی اور ان پندرہ دنوں میں تین چار بار عقیل آیا تھا اور دو تین دن کے لئے وہ عقیل کے ساتھ ایبٹ آباد اور لاہور بھی گیا تھا۔ کتنی ساری فائلوں اور کاغذات پر اُس کے دستخط لئے تھے اُس نے۔

”یہ آپ کیا کرتے پھر رہے ہیں افروز!۔۔۔۔ آپ کو کچھ نہیں ہو گا، ان شاءاللہ۔ یہ سب وقتی تکلیف ہے۔ ابھی دوسری بار تھراپی ہونی ہے نا۔“

وہ جیسے خود کو تسلی دیتی تھی۔ اور افروز اسے یوں تکتا تھا جیسے کوئی بڑا کسی بچے کی احمقانہ بات پر اسے تکتا ہے، اُس کی لاعلمی پر اور اس کی معصومیت پر۔

”وہ اخلاق احمد وہی مشہور سنگر، بلڈ کینسر کے بعد کتنے سارے سال زندہ رہے تھے تو آپ کیوں نہیں افروز؟“

”ہر آدمی کی اپنی عمر ہوتی ہے تمکین! جتنی لکھ دی جاتی ہے۔“

”اور بھی تو کئی لوگ ہوں گے، جو اس بیماری کے باوجود سالوں زندہ رہتے ہوں گے۔“

”ہاں، لیکن شاید میں نہیں۔۔۔۔ حالانکہ میں نے بھی تو چاہا تھا تمکین!۔۔۔۔ دعا کی تھی کہ زیادہ نہیں تو چند سال، صرف چند سال اور لیکن۔۔۔۔“ اُس روز اُس نے پھر ساری رات اُس سے باتیں کی تھیں۔

”سنو تمو! میں نے تمہارے لئے اور اپنے بچے کے لئے اپنی طرف سے۔۔۔۔“

”پلیز!۔۔۔۔ پلیز افروز۔۔۔۔!“ وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر رو دی تھی۔ ”مت کریں مجھ سے ایسی باتیں۔“

”دیکھو تمکین!“ اُس نے نرمی سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا تھا۔ ”اس وقت میں جو کہہ رہا ہوں، دھیان سے سنو۔ میری جائیداد میں شریعت کے مطابق جو تمہارا حصہ ہے وہ تمہارے نام کر دیا ہے میں نے۔ اور جو میرے بچے کا ہے، وہ اس کے نام۔ اور تم اس کی گارڈین ہو گی۔ بہت کچھ تو بھائی صاحب نے بیچ کھایا ہے، تاہم پھر بھی اتنا ہے کہ تمہیں اور تمہارے بچے کو کبھی تکلیف نہیں ہو گی۔ بوسٹن والے میرے گھر کو فروخت کر کے بہت جلد انکل افضل رقم تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیں گے۔ میں نے انہیں تمہارا

اکاؤنٹ نمبر دے دیا ہے۔اماں اور آپا سیدھی سادی عورتیں ہیں، لیکن بھائی صاحب انتہائی چالاک شخص ہیں۔ تم ان سے محتاط رہنا ہمیشہ۔یہاں کا کاٹیج اور لاہور والا گھر، دونوں میں اماں کا بھی حصہ ہے، بابا کی بیوی ہونے کے ناتے۔۔۔۔میں سوچ رہا ہوں، تمو! لاہور والا گھر اماں لے لیں اور یہ کاٹیج تم لے لو۔۔۔۔لیکن میں نے ابھی ان سے بات نہیں کی۔ابھی میں نے اس کے متعلق سوچا بھی نہیں ہے۔لاہور والے گھر کی قیمت اس گھر کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔یا پھر نہیں،، وہ گھر تمہارے اور بچے کے نام ہی رہے گا، تعلیم کے سلسلے میں۔''

وہ بولتے بولتے تھک گیا تو وہ اس کے کندھے سے سر ٹکا کر رونے لگی تھی۔کچھ دیر وہ اسے تھپکتا رہا۔

''چلو تمکین! ناران چلیں۔۔۔ان ساری جگہوں پر ایک بار پھر جائیں، جن جگہوں پر ہم نے خوشیوں کے سنگ وقت بِتایا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے روتے ہوئے کہا تھا۔''آپ کی طبیعت کچھ بہتر ہو جائے تو چلیں گے۔لیکن موسم بدل رہا ہے، اب کچھ ٹھنڈ ہو چلی ہے۔''

''تمکین!''

''ایک بات کہوں؟''

اُس نے سر ہلایا۔

''پہلے منہ ہاتھ دھو کر آئو۔بلکہ اپنے اور میرے لئے دو کپ کافی بنالائو۔''

وہ خاموشی سے اُٹھ کر چلی گئی۔اور جب وہ کافی لے کر آئی تو وہ آنکھیں موندے لیٹا تھا۔وہ کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اس کے قریب بیٹھ گئی اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔وہ کچھ دیر یونہی آنکھیں موندے اس کے ہاتھوں کو اپنے بالوں میں محسوس کرتا رہا۔کتنے گھنے بال تھے افروز کے، جواب جھڑ رہے تھے۔اور وہ کہتے تھے کہ Immuno Theropy سے بال نہیں جھڑتے لیکن افروز کے بال تو جھڑ رہے تھے۔ کتنے کم بال رہ گئے تھے، اُس کے سر پر۔

یکایک اُس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور مسکراتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔وہ اُس کی خوشنودی کے لئے لبوں پر لائٹ پنک کلر کی لپ اسٹک لگا کر آئی تھی اور اُس کی پسندیدہ خوشبو بھی لگائی تھی۔

''بہت خوب صورت لگ رہی ہو، تمکین! پتہ ہے ان دنوں تم کتنی بے تحاشا خوب صورت ہو گئی ہو۔تم پہلے تو اتنی خوب صورت نہیں تھیں یار!'' وہ ہنسا۔''یہ ہمارے صاحبزادے صاحب کا کمال ہے۔''

''وہ صاحبزادی بھی ہو سکتی ہے۔''

''لیکن میری خواہش ہے کہ وہ صاحبزادہ ہی ہو۔تمہارے لئے سہارا ہو گا۔اگر تمہیں کوئی سہارا مل بھی گیا، تب بھی بیٹا ہو گا تو اسے کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔''

اُس نے ناراضی سے اسے دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر کافی کا کپ اٹھالیا۔

"پلیز تمکین! اتنی ناراض نظروں سے مت دیکھو۔ بہت سی حقیقتیں بہت ظالم ہوتی ہیں لیکن انہیں قبول کرنا پڑتا ہے۔" اس نے تمکین کے ہاتھ سے کافی کا کپ لے لیا۔

"تمکین! میری جان! تم ابھی کم عمر ہو، ینگ ہو اور زندگی بہت ظالم ہے۔ میں نے آپی سے بھی کہا ہے کہ۔۔۔۔" وہ کچھ دیر کو خاموش ہو کر اسے دیکھتا رہا۔

"دیکھو، اگر کوئی اچھا اور مخلص شخص مل جائے اور تمہاری طرف ہاتھ بڑھائے تو اس کے ہاتھ کو جھٹکنا مت۔ تنہا جینا اور وہ بھی عورت کے لئے، آسان نہیں ہوتا۔ اور پھر تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔ شادی شدہ زندگی کے صرف چند ماہ۔ اور ان میں سے بھی صرف تین ماہ کی خوشی۔۔۔۔"

وہ یک دم ہی اُس کے پاس سے اٹھ کر بھاگتی ہوئی دروازہ کھول کر ٹیرس پر چلی گئی تھی اور جنگلے سے ٹیک لگا کر زور زور سے رونے لگی تھی۔ روتے روتے اُس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں، جب افروز نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"تمکین۔۔۔۔!"

تمکین نے مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

"سوری تمو!۔۔۔۔ اس طرح ناراض مت ہوا کرو۔ پتہ نہیں آج، کل، پرسوں، کب میں اچانک چلا جاؤں۔ اور۔۔۔۔" وہ اُس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامتے ہوئے افسردگی سے اسے دیکھا۔

"تم بھی کیا کہتی ہو گی، میں نے تمہیں سوائے آنسوؤں کے کچھ نہیں دیا۔"

"آپ اس طرح کی باتیں مت کیا کریں، افروز!"

وہ تڑپ کر بولی تو افروز نے اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بہت نرمی اور آہستگی سے اس کے آنسو پونچھے۔

"تم روتی ہو نا، تمو! تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا دل تمہارے آنسوؤں کے ساتھ کٹ کٹ کر گر رہا ہو۔ مت رویا کرو نا!"

تمکین کی پلکیں پھر بھیگنے لگیں۔

"سنو تمکین! میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میرے بعد تم ضرور شادی کر لینا۔ میں جانتا ہوں اس وقت میرے لئے یہ کہنا اور تمہارے لئے یہ سننا آسان نہیں ہے۔ لیکن مرد ہونے کے ناتے جو کچھ میں سمجھتا ہوں، وہ تم نہیں سمجھ رہی ہو۔ میں صرف تمہیں یہ سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ اگر کبھی زندگی میں تم یہ محسوس کرو کہ تم تنہا نہیں رہ سکتی ہو تو اگر کوئی تمہارا ہاتھ تھامنا چاہے اور وہ مخلص بھی ہو تو ڈرنا مت۔ یہ نہ سوچنا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ میری روح کو تکلیف ہو گی۔ میری روح تمہیں تکلیف اور پریشانی میں دیکھ کر دکھی ہو گی۔ تمکین! تم وہی کرنا، جو تمہیں اور پھر آپی کو بہتر لگے۔ یہ تمہارا حق بھی ہے اور شریعت میں بھی یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔"

تمکین نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ سر جھکائے کھڑی ہونٹ کاٹتے ہوئے آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

"میں نے یہ بات آج تمہیں اس لئے کہی ہے تمکین ! کہ کل جب تمہیں کسی اپنے اور ہمدرد کی ضرورت ہو گی توتب میں نہیں رہوں گا۔ تب تم مجھے سوچ لینا۔ اور پلیز تمکین ! مجھے معاف کر دو، اس لئے، جس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ لیکن میں پھر بھی خود کو تمہارا مجرم سمجھتا ہوں۔۔۔ کچھ باتیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوتیں۔ ان کا دکھ اور کرب اپنی جگہ پر۔"

تمکین نے بھیگتی ہوئی آواز میں آہستگی سے کہا۔

"یہ میری تقدیر ہے اور آپ نے ہی کہا تھا کہ یہ کتاب میں لکھا جا چکا تھا اور ایسے بھی ہونا تھا۔ پھر آپ اس طرح کی باتیں کیوں کرتے ہیں افروز !"

"ہاں۔۔۔ یہ کتاب میں لکھا جا چکا تھا۔ اللہ اپنی مصلحتیں خود ہی سمجھتا ہے۔ شاید اسے تمہاری آزمائش اور صبر مقصود ہو اور مجھ ایسے گناہ گار بندے کو چند دنوں کی خوشی عطا کرنا۔" اُس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"چلو تمکین ! نیچے وادی میں چلیں اور دُور تک چلتے جائیں۔۔۔ چلتے جائیں۔ تمکین ! تم محسوس کر سکتی ہو، اُس شخص کے دل کا حال، جسے علم ہو کہ بس چند دن، چند لمحے۔۔۔ یہ جگہ جہاں وہ کھڑا ہے، کل وہ یہاں نہیں ہو گا۔ یہاں اس ٹیرس پر کھڑے ہو کر وہ سامنے جن پہاڑوں کے پیچھے سورج کو اُبھرتے اور ڈوبتے دیکھتا تھا وہ شاید ان کو آخری بار دیکھ رہا ہو۔"

وہ ہولے سے ہنسا۔۔۔ کیسی ہنسی تھی وہ، جو تمکین کے دل کو چیرتی چلی گئی۔

"ہر بار جب عقیل آتا ہے تو میں اسے رخصت کرتے ہوئے سوچتا ہوں شاید یہ آخری بار ہے، جب میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ ہر صبح ناشتہ کرتے، کھانا کھاتے، چائے پیتے میرے دل میں خیال آتا ہے، یہ آخری کھانا، ناشتہ اور چائے ہے۔ ہر رات آنکھیں بند کرتے ہوئے مجھے خوف آتا ہے تمکین ! کہ اب شاید یہ آنکھیں دوبارہ نہ کھلیں۔ میں فطری نیند کی خواہش کو جھٹک جھٹک کر خود کو جگائے رکھتا ہوں۔ تمہیں دیکھتا ہوں، کیا پتہ یہ آخری بار ہو، پھر۔۔۔"

"آپ نے ابھی کہا تھا کہ وادی میں چلتے ہیں۔" تمکین نے بہ مشکل خود کو کمپوز کرتے ہوئے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ اُسے اس کیفیت سے باہر لانا چاہتی تھی۔ خود اُس کا جی دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ وہ تیزی سے کمرے کی طرف مڑی اور جوتوں کے ریک سے کینوس کے بند جوتے نکالنے لگی۔ ڈاکٹر نے اُسے ہیل پہننے سے منع کر رکھا تھا۔ اور پھر جھک کر جوتے پہنتے ہوئے اس نے بے اختیار اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو ہتھیلیوں کی پشت سے پونچھا تھا اور پھر افروز کی طرف دیکھے بغیر دروازے کی طرف بڑھی تھی۔

"چلیں آپ آئیں، میں آپا کو اور اماں کو بتا دوں۔"

"تمکین ! رکو۔" اُس نے بیڈ پر پڑی اُس کی سیاہ شال اٹھا کر اس کے کندھوں پر ڈالی۔ اگرچہ ستمبر کا مہینہ تھا، لیکن یہاں، پہاڑی علاقوں میں شام کے وقت ہلکی خنکی ہو جاتی تھی۔

"شال پہنائے گا اب کون تمہیں

بارشوں میں کبھی بھیگو گے تو یاد آئوں گا"

بہت آہستگی سے اُس نے کہا۔

تمکین کا دل جیسے اب پانی ہو کر آنکھوں سے بہنے کو بے تاب ہو گیا۔ لیکن مڑ کر افروز کی طرف دیکھے بغیر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ وہ جانتی تھی، اگر اس نے مڑ کر افروز کی طرف دیکھ لیا تو جو درد اور حسرت اس کے لہجے میں تھی، وہی حسرت اس کی آنکھوں میں وہ کیسے دیکھ پائے گی، کیسے ضبط کرے گی۔

آپا اُسے نیچے لائونج میں ہی مل گئی تھیں۔

"آپا! میں اور افروز ذرا باہر جا رہے ہیں۔"

"توبہ ہے، لڑکی! تجھے چین نہیں گھر پر؟۔۔۔ مرنے والے شخص کو آرام سے گھر میں بیٹھنے دے، نہ کہ گلی گلی لے کر گھومنے نکل پڑتی ہے۔"

"آپا!" وہ حیرت سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

'کیسی عورت ہے یہ؟۔۔۔ بھلے افروز کی سگی بہن نہیں تھی، لیکن۔۔۔'

"چلو تمکین!" افروز نے شاید آپا کی بات سن لی تھی۔ اُس کے قریب آکر اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور پھر شہر بانو کی طرف دیکھا۔

"آپا! اندر گھر میں میرا دل گھبراتا ہے۔ ذرا دیر کو کھلی فضا میں جانے سے طبیعت کو اچھا محسوس ہوتا ہے۔"

"ہائے میرا جوان بھائی۔ جانے کس کی نظر لگ گئی اسے۔۔۔" وہ منہ پر دوپٹہ رکھ کر رونے لگیں۔

افروز رُکا نہیں تھا، اُس کا ہاتھ تھامے گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ بہت دور نہیں گئے تھے۔ تمکین نے محسوس کیا تھا کہ وہ کچھ تھک سا گیا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے پہاڑی ٹیلے پر ایک خالی کاٹیج، جس کی گھاس پھونس کی چھت ٹوٹ کر اندر گری ہوئی تھی، دروازے بھی ٹوٹے ہوئے تھے کے پاس بیٹھ گئے۔

"کبھی یہاں بھی کوئی رہتا ہوگا۔ اس کاٹیج میں بھی زندگی سانس لیتی ہوگی۔"

"ہاں، دلبر نے بتایا تھا کہ پچھلی سردیوں میں یہ لوگ نیچے میدانوں میں چلے گئے تھے، پھر آئے ہی نہیں۔"

وہ دونوں بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ حتیٰ کہ سورج کا سرخ گولا سامنے پہاڑوں کے درمیان آکر ٹھہر گیا، تب وہ اُٹھے تھے۔

"زندگی کا دریا اب تو بجھنے کو ہے

دن گزر بھی گیا، شام ڈھلنے کو ہے"

ڈوبتے سورج پر نظریں جمائے جمائے افروز نے زیر لب کہا تو تمکین نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

کہاں۔۔۔ دن کہاں گزرا؟ ابھی تو اس نے دن کی دہلیز پر قدم رکھا تھا اور شام۔۔۔ شام کے تو کہیں دُور تک آثار نہیں تھے۔ لیکن زندگی کا دیا بجھنے والا تھا۔

اُس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا لیا اور افروز کے چہرے سے نظریں ہٹا کر سنبھل سنبھل کر نیچے اُترنے لگی۔ افروز ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔

اس چھوٹی سی پہاڑی سے نیچے اُتر کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ افروز ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ اپنے آنسو اور اپنی اندرونی کیفیت چھپانے کے لئے وہ تیزی سے نیچے اُتری تھی اور اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا کہ افروز آ رہا تھا یا نہیں۔ افروز ابھی تک وہیں کھڑا سورج کو دیکھ رہا تھا، جو اب تیزی سے پہاڑوں کے پیچھے غائب ہو رہا تھا۔

''افروز۔۔۔۔!''

اُس نے اُسے بلایا۔ تبھی ایک شخص کو اُس نے کاٹیج کے پیچھے سے نکلتے اور اُس کی ٹوٹی ہوئی چھت اور دروازے کو پھلانگ کر افروز کی طرف آتے دیکھا۔

اب وہ افروز کے قریب کھڑا اُس سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ پھر وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔ شاید افروز کا کوئی جاننے والا تھا۔

وہ سامنے دو چھوٹے لڑکوں کو بکریوں کے ساتھ آتے دیکھنے لگی۔ دونوں کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی چھڑیاں تھیں اور وہ شاید اپنی بکریوں کو چرا کر اب اپنے گھر واپس جا رہے تھے۔ اُن کے سرخ و سپید چہروں پر زندگی کی چمک اور آنکھوں میں روشنی تھی۔ ہر غم و فکر سے بے نیاز وہ ہنستے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ اُن کی بھیڑ بکریاں، اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ پھر وہ بکریوں کو اکٹھا کر کے اسی طرح ہنستے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ اُن کی بھیڑ بکریاں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ پھر وہ بکریوں کو

اکٹھا کر کے اسی طرح ہنستے ہوئے اس کے پاس سے گزر گئے تو اس نے مڑ کر دیکھا، افروز اس شخص کے ساتھ باتیں کرتا ہوا نیچے اُتر رہا تھا۔ پھر اُس کے پاس آ کر اس نے اس شخص سے ہاتھ ملایا۔

''اچھا، دلیر خان چاچا! میں کل شاید ایبٹ آباد جاؤں۔ آپ پرسوں آنا گھر، پھر باتیں ہوں گی۔''

''بہو ہے؟'' دلیر خان نے پوچھا تو افروز نے سر ہلا دیا۔ دلیر خان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھا۔

''چاچا! اس کی کیا ضرورت تھی؟'' افروز نے کہا۔

''بہو کو پہلی بار دیکھا ہے، بیٹا! اس وقت یہی تھا۔ معمولی رقم ہے، حقیر ہے، پر روایت ہے نا۔۔۔۔ پھر گھر آؤں گا۔'' وہ کچھ شرمندہ سا لگ رہا تھا۔

''مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا کہ تم کب آئے یہاں۔ یوں بھی میں تو ادھر ہری پور چلا گیا تھا۔ یہاں تو بس چند دن پہلے ہی آیا ہوں۔ پلوشے بیمار تھی، اُسی کی خیر خبر لینے۔ بہت دنوں سے پیغام بجھوا رہی تھی کہ لالہ! آ کر مل جاؤ۔''

افروز نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ ایک بار پھر اس سے ہاتھ ملا کر اور اس کے کندھوں پر تھپکی دے کر واپس مڑ گیا۔ وہ پھر اس پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔ شاید کاٹیج سے پیچھے دوسری طرف اسے جانا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ بالوں میں کہیں کہیں سفیدی جھلکتی تھی۔ براؤن رنگ کی شلوار قمیض پر اُس نے کریم کلر کی واسکٹ پہن رکھی تھی۔

"یہ کون تھا، افروز۔۔۔۔؟"

"جب میں پاکستان میں تھا تو یہ بابا کے پاس منشی تھا۔ بابا ڈرائی فروٹ کا کاروبار کرتے تھے، تمہیں پتہ ہے نا؟"

تمکین نے سر ہلایا۔

افروز نے پھر گھر تک کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا اور اُس کی پیشانی پر لکیریں پڑی تھیں۔

تمکین کو وہ بہت مضطرب اور بے چین بھی لگا تھا۔ وہ نیچے رُکے بغیر سیدھا اوپر اپنے بیڈروم میں چلا گیا تھا۔

حالانکہ جب کبھی وہ باہر سے آتے تھے تو وہ کچھ دیر مہربانو کے پاس ضرور بیٹھتا تھا۔ مہربانو کے مزاج میں شہر بانو کی نسبت نرمی تھی۔ عموماً وہ ان سے اپنے بابا کی باتیں کرتا تھا۔ اُن کے بچپن کی باتیں سننا اسے اچھا لگتا تھا۔

"بابا جیسے لوگ دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں، تمکین!۔۔۔۔ ہے نا؟" وہ اکثر کہتا تھا۔ جب مہربانو ان کے بچپن یا لڑکپن کی کوئی بات بتاتی تھیں۔ مہربانو کا اور ان کا بچپن، لڑکپن ایک ہی گھر میں گزرا تھا۔ لیکن آج وہ انہیں سلام کرنے کے لئے بھی نہیں رکا تھا۔

VVV

"افروز! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" تمکین نے اُسے کمرے میں آکر بیڈ پر لیٹتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"یہ سوال کیوں کرتی ہو، تمو؟" اُس کے لہجے میں تھکن تھی۔ "اب طبیعت ایک ہی بار ٹھیک ہو گی۔"

تمکین صرف بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"لیکن اس وقت میری طبیعت ٹھیک ہی ہے۔"

"آپ نے کل ایبٹ آباد جانا ہے۔ مجھے بتایا تو نہیں پہلے۔۔۔۔؟"

"ہاں، بس اچانک ہی پروگرام بنا ہے۔ تم رات میں میرے دو جوڑے کپڑے اور دوسری ضرورت کی چیزیں بیگ میں رکھ دینا۔"

"آپ اکیلے جائیں گے؟"

وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، پھر ایک گہری سانس لی۔

"ٹھیک ہے، تم بھی چلنا۔"

"آپ عقیل بھائی کو بلوا لیتے۔ آپ ڈرائیو کریں گے، خود؟"

"ہاں، کر لوں گا۔ لیکن چلو، شیر زمان کے بیٹے کی جیپ پر چلے جائیں گے۔ ابھی دلبر سے کہہ دینا کہ رات واپسی پر اسے بتا دے کہ صبح ہم نے جانا ہے۔"

"افروز! جب سے آپ آئے ہیں، کوئی چیک اپ وغیرہ نہیں ہوا۔ اگر چیک اپ کے لئے لاہور چلے جائیں تو۔۔۔ پتہ نہیں کیا صورتِ حال ہے۔ انفیکشن کم ہو رہا ہے یا زیادہ، کچھ پتہ نہیں۔ اور سفید ذرّات پتہ نہیں کم ہو رہے ہیں یا۔۔۔"

"میں باقاعدگی سے میڈیسن تو لے رہا ہوں تمکین! اور فی الحال چیک اپ کی ضرورت نہیں۔ اس کا کچھ فائدہ بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں۔" اُس نے تھکے تھکے انداز میں کہا اور آنکھیں موند لیں۔ اس رات وہ بے حد بے چین اور مضطرب سا رہا۔ جب بھی تمکین کی آنکھ کھلتی، وہ یا بیٹھا ہوتا یا کمرے میں ٹہل رہا ہوتا۔

"پلیز تمکین! تم سو جائو۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ بس نیند نہیں آرہی۔" اس کے بار بار استفسار پر وہ جھلّا گیا تھا۔

دلیر خان چاچا سے ملنے کے بعد سے وہ اپ سیٹ لگ رہا تھا۔ دلیر خان چاچا نے کیا کہا تھا؟

"عقیل بھائی تو ٹھیک ہیں نا؟" اُس نے ایک بار پھر پوچھا۔ تب اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ دروازہ کھول کر باہر ٹیرس پر چلا گیا تھا۔

'شاید اس وقت اسے تنہائی کی ضرورت ہے۔'

اُس کے پیچھے جاتے جاتے تمکین پھر لیٹ گئی تھی۔ اس نے ایک بار کہا تھا۔ "تمو! تم ایک ایسے شخص کی کیفیات کو نہیں جان سکتیں، جو جانتا ہو کہ ایک یقینی موت اس سے چند دنوں کے فاصلے پر کھڑی ہے۔" اور اس وقت وہ جانے کن کیفیات سے گزر رہا تھا۔

اُس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو نکل کر تکیہ بھگونے لگے۔۔۔ اس شخص کی کیفیات کو بھی کوئی کیسے جان سکتا ہے، جسے علم ہو کہ اس کی عزیز ہستی کو چند دنوں یا چند مہینوں بعد موت کا فرشتہ دبوچ کر لے جانے والا ہے۔

پھر یونہی آنسو بہاتے بہاتے وہ سو گئی۔ دوبارہ جب اُس کی آنکھ کھلی تو افروز نماز پڑھ رہا تھا۔ اور جب سے وہ واپس آیا تھا، وہ باقاعدگی سے نماز اور قرآن پڑھتا تھا۔ اکثر قرآن پڑھتے پڑھتے وہ رو پڑتا۔

"تمو! میں نے کبھی کسی کا دل نہیں دُکھایا، کبھی کسی سے زیادتی نہیں کی، کسی کو دھوکا نہیں دیا، کسی کا حق نہیں مارا۔ امریکہ اور یورپ میں رہ کر بھی کوئی بری عادت نہیں اپنائی، حتیٰ کہ سگریٹ تک نہیں پی کبھی۔ ہاں، نماز میں کبھی کبھی کوتاہی ہو جاتی تھی۔ اللہ مجھے معاف کر دے گا نا، تمو؟۔۔۔ تم میرے لئے ہمیشہ دعا کرنا۔ ہم انسان کتنے غافل ہوتے ہیں نا۔۔۔ سوچتے ہیں، آج نماز رہ گئی ہے تو کوئی بات نہیں، کل سے پانچوں وقت کی نماز پڑھیں گے۔ لیکن ہمارے عہد یوں ہی ہم پر ہنستے رہ جاتے ہیں اور موت کا فرشتہ ہمیں اچک کر لے جاتا ہے۔"

تمکین اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اب وہ دعا مانگ رہا تھا اور اُس کے آنسو اُس کی ہتھیلیوں پر گر رہے تھے۔ تمکین کچھ دیر یونہی بیٹھی اُسے دعا مانگتے دیکھتی رہی، پھر اُٹھ کر وضو کرنے چلی گئی۔

VVV

محفوظ خان آٹھ بجے جیپ لے کر آگیا تھا۔ شہر بانو نے حیرت سے تمکین کو بیگ اٹھائے نیچے آتے دیکھا۔

"تم کہاں جا رہی ہو۔۔۔۔؟"

"ہم ایبٹ آباد جا رہے ہیں۔" تمکین نے بیگ نیچے رکھا اور اس کے پیچھے آتے افروز نے دلبر کو آواز دی۔

"دلبر! یہ بیگ اٹھا کر باہر جیپ میں رکھو۔"

ناشتہ دونوں نے اوپر اپنے کمرے میں ہی کر لیا تھا۔

"میں کہتی ہوں، افروز! تیرا دماغ چل گیا ہے۔ چند دن جو زندگی کے باقی ہیں، سکون اور آرام سے گزار لو اپنے گھر پر۔ کیوں لور لور پھرتا ہے؟"

شہر بانو کو جانے اُن کے جانے پر غصہ تھا یا پہلے سے اطلاع نہ دینے پر۔

افروز نے بس ایک نظر انہیں دیکھا تھا اور دلبر کو دوبارہ آواز دینے لگا تھا۔

"میں نے کیا کہا ہے، افروز! تم نے سنا نہیں؟"

شہر بانو کو اس طرح اپنا اگنور ہونا پسند نہیں آیا تھا۔ وہ صوفے سے اُٹھ کر اس کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔

"آپا! مجھے کام ہے ضروری۔" افروز نے ان کی طرف دیکھے بغیر آہستگی سے کہا تھا اور قدم آگے بڑھا دیئے تھے۔

"آخر ایسے تیرے کیا کام ہیں کہ اس حالت میں بھی چین نہیں تجھے؟ تمکین کو ہی شوق ہوا ہو گا میکے جانے کا۔۔۔ تو اسے بھیج دو، دلبر کے ساتھ اور خود یہ آخری دن اپنے گھر میں ہی رہو۔ پردیس کی موت۔۔۔۔"

تمکین کا پورا وجود ایک لمحے کو کانپ گیا۔ آپا ہمیشہ کتنی سفاکی سے بات کرتی تھیں۔ بھلے ان کا کوئی رشتہ نہیں تھا، افروز سے لیکن انسانیت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ اور پھر افروز اُن کا نہ سہی، ان کی ماں کے کزن کا بیٹا اور سگے چچا کا پوتا تھا، اسی دور کے رشتے کے حوالے سے ہی سہی۔

"موت تو جہاں لکھی ہے، وہاں ہی آنی ہے آپا! اگر پردیس میں لکھی ہے تو وہیں آئے گی۔" افروز اپنی بات کہہ کر رکا نہیں تھا۔ تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ شہر بانو کا منہ کھلا اور بند ہو گیا۔ تمکین کو بھی افروز کے رویے پر حیرت ہوئی تھی۔ وہ اماں سے ملنے بھی نہیں گیا تھا حالانکہ جب بھی کہیں باہر جانا ہوتا تھا، وہ اماں اور آپا سے مل کر اور انہیں خدا حافظ کہہ کر جاتا تھا۔ لیکن شاید آپا کی بات نے افروز کو اپ سیٹ کر دیا تھا۔ وہ خود بھی تو اپ سیٹ ہو گئی تھی۔ کیا تھا اگر آپا اس طرح کی بات نہ کرتیں۔ اور پھر اس وقت جب وہ گھر سے نکل رہے تھے، خوامخواہ وہم سے آنے لگے تھے دل میں۔

وہ بے حد افسردہ سی افروز کے پیچھے چلتی ہوئی جیپ میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ کافی راستہ خاموشی میں کٹا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کچھ سوچ رہے تھے۔ تمکین کے دل پر ایک دم ہی بوجھ سا آ پڑا تھا۔

دو میل اڈے پر جیپ روکتے ہوئے محفوظ خان نے پوچھا تھا۔

"صاحب! چائے، پانی کچھ چاہیے؟"

"نہیں محفوظ خان! تم نے چائے پینی ہو تو پی لو جا کر۔"

محفوظ خان جیپ سے اُترا۔

"بس ایک جپ چائے پیوں گا۔ ابھی آیا۔"

"محفوظ خان!" افروز نے بے اختیار اسے پکارا۔

"جی صاحب؟" وہ رک گیا۔

"کبھی شیر زمان چاچا نے تم سے بابا کی کوئی بات کی، کچھ بتایا؟"

"وہ تو جب تک زندہ رہے، اکثر بڑے صاحب کو یاد کر کے اُن کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ انہیں اس بات کا بہت رنج تھا کہ آپ ان کے آخری وقت ان کے پاس نہیں تھے۔ بڑی بی بی اور چھوٹی بی بی صاحبہ نے آپ کو ان کی بیماری کی اطلاع نہیں دی تھی تو بس بابا کا دل اسی بات پر ان سے برا ہو گیا تھا اور وہ بی بی جی کے روکنے کے باوجود نوکری چھوڑ کر گھر آ گئے تھے۔ پھر میں نے بھی ڈرائیوری شروع کر دی تھی تو میں نے بھی منع کر دیا تھا۔"

"باباجان کی بیماری کے حوالے سے کوئی بات کرتے تھے وہ؟ کوئی خاص بات؟"

"نہیں، کوئی خاص بات نہیں۔ بس روتے تھے کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ صاحب اتنے بیمار ہیں کہ دنیا سے چلے جائیں گے۔ پتہ چلتا تو کبھی صاحب کو ایک لمحے کے لئے بھی اکیلا نہ چھوڑتا۔"

"اچھا۔۔۔" افروز نے ایک گہری سانس لی تھی۔ "جاؤ، تم چائے پی کر آجاؤ۔" اور پھر تمکین کی طرف دیکھا۔

"تم ٹھیک ہو نا، تمو!۔۔۔ گھبراہٹ وغیرہ تو نہیں ہو رہی؟ اگر تھک گئی ہو تو کچھ دیر یہاں رک جاتے ہیں۔"

"نہیں، میں ٹھیک ہوں بالکل۔"

افروز سر ہلا کر پھر کسی گہری سوچ میں کھو گیا تھا۔

وہ سیدھے تسکین کی طرف گئے تھے۔ بوا اور تسکین انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ تسکین کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔

"آپ نے بتایا تک نہیں آپی؟" اس نے گلہ کیا تو وہ افسردگی سے مسکرا دیں۔

"تم پہلے ہی کیا کم پریشان ہو، جو تمہیں اور پریشان کرتی میں؟"

"دو تین دن پہلے تو بٹیا کی طبیعت ہی بگڑ گئی تھی۔ بی پی تو بہت ہائی ہو گیا تھا۔ میں نے تو کہا بھی کہ تمکین بٹیا کو بتاؤ، لیکن اس نے نہیں مانی میری بات۔" بوا نے گلہ کیا تو تسکین افسردگی سے مسکرا دی۔

"بوا! آپ کچن میں جائیں۔ جب تک افروز فریش ہو کر آتا ہے، آپ چائے بنالیں۔ بعد میں پھر کھانا لگادیجئے گا۔ سفر کی تکان دور ہو جائے گی۔ باہر سے کچھ منگوا لیجئے گا۔"

"آپی! آپ کتنی کمزور ہو گئی ہیں۔ اپنا خیال نہیں رکھتیں نا؟" تمکین ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر بیٹھ گئی تھی۔

"اور اپنی حالت دیکھی ہے تم نے؟" انہوں نے خفگی سے اسے دیکھا تو تمکین مسکرائی۔

"مجھے کیا ہوا ہے؟۔۔۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اپنی طرف سے تو انسان اچھا ہی کرتا ہے نا تمو! لیکن تقدیر کا کیا پتہ ہوتا ہے۔" انہوں نے افسردگی سے کہا۔

"تمہارا سوچتی ہوں تو دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔ افروز کا خیال دل کو کاٹتا رہتا ہے۔"

"آپی! انسان تقدیر سے تو نہیں لڑ سکتا نا۔ پھر۔۔۔"

"ہاں۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "پتہ ہے۔" اُن کی آواز مدھم ہو گئی۔ "چند دن پہلے کراچی سے فون آیا تھا۔"

"کس کا۔۔۔؟" اُس نے بے دھیانی میں پوچھا۔

"سعادت انکل کے بیٹے کا۔"

وہ یک دم چونک گئی۔

"کس لئے۔۔۔؟"

"معذرت کر رہا تھا کہ وہ جلدی رابطہ نہیں کر سکا۔ دراصل انکل سعادت مرزا کو وہ اپنے ساتھ امریکہ لے گیا تھا۔ وہاں ان کا ہارٹ بائی پاس ہوا تھا۔ لیکن کچھ ایسا ہوا تھا کہ وہ چند ماہ بعد کومے میں چلے گئے۔ کچھ کلاٹ بن گئے تھے۔ تقریباً چھ ماہ وہ بیڈ پر رہے اور ان کی ڈیتھ کے بعد بھی وہ اتنا اپ سیٹ رہا کہ رابطہ نہیں کر سکا۔ ابھی دو ہفتے پہلے ہی وہ کراچی آیا۔"

"تو۔۔۔؟" اُس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"تو کچھ نہیں۔۔۔ وہ اپنے باپ کا قول نبھانا چاہتا تھا۔ میں نے بتا دیا، تمہاری شادی کا۔۔۔"

تبھی افروز، منہ ہاتھ دھو کر آ گیا تھا۔

"میں ذرا عقیل کی طرف جا رہا ہوں۔"

"بوا چائے بنا رہی ہیں، افروز!" تسکین آپی نے کہا۔

"نہیں آپی! مجھے جلدی جانا ہے۔ اور کھانے پر بھی میرا انتظار مت کیجئے۔۔۔ ان شاء اللہ رات کا کھانا آپ کے ساتھ کھاؤں گا۔۔۔ او کے تمکین!۔۔۔ اور آپی! اپنی پگلی بہن کو سمجھایئے گا۔"

اُس نے لبوں پر ایک شعوری مسکراہٹ سجائی اور باہر چلا گیا۔ پتہ نہیں، ایسا کیا کام تھا اُسے؟

VVV

عقیل اور وہ رات کو ہی گھر آئے تھے۔ افروز تھکا ہوا تھا اور آتے ہی صوفے پر نیم دراز ہو گیا تھا۔

"کیسی ہو تمو؟" عقیل بھی بجھا بجھا سا تھا۔

"ٹھیک ہوں، عقیل بھائی! کیا آپ ڈاکٹر کی طرف بھی گئے تھے؟"

"نہیں، آج تو نہیں گئے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے افروز کی طرف دیکھنے لگا۔

"افروز یار! کیا خیال ہے، کل چلیں اسلام آباد۔ بلڈ ٹیسٹ وغیرہ ہو جائے گا۔ یا پھر لاہور چلتے ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے، جیسے تمہیں بلڈ لگنا چاہئے اب۔ کس قدر زرد رنگ ہو رہا ہے تمہارا۔"

افروز نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"وہاں دو بار بلڈ لگا مجھے۔ لیکن پھر انفیکشن ہو گیا اور بڑی تیزی سے سفید ذرات ختم ہو گئے۔"

"وہ ٹرانس پلانٹیشن وغیرہ سے بھی تو علاج ہوتا ہے۔ جس میں ہڈیوں کا گودا چینج کرتے ہیں۔" تسکین نے افروز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں آپی! ہوتا ہے ایسا۔۔۔ لیکن میری اپنے ڈاکٹرز سے تفصیلی بات نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ دو بار انہوں نے مجھے کال بھی کیا تھا۔" افروز اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ "میں ایک بار پھر سوچ رہا ہوں، امریکہ واپس جانے کا۔"

"تمہیں آنا ہی نہیں چاہئے تھا افروز! چند دنوں تک تمو بھی آجاتی تمہارے پاس۔"

"ہاں آپی! لیکن تب۔۔۔" اُس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "میں بہت اکیلا تھا وہاں پر۔ اور مایوسی میرے اندر پنجے گاڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ موت۔۔۔ یقینی موت۔ ہر طرف مجھے یہی

لکھا نظر آرہا تھا۔ حالانکہ تب میں جینے کی لگن لے کر ہی وہاں گیا تھا۔ مجھے تمکین کے لئے، اپنے بچے کے لئے زندگی کی ضرورت تھی۔ میں نے رو رو کر، گڑ گڑا گڑ گڑا کر اللہ سے زندگی کی دعا مانگی تھی۔ لیکن کوئی میرے اندر مسلسل کہتا رہتا تھا کہ زندگی جتنی لکھی تھی، اتنی پوری ہوا چاہتی ہے۔ اور آپی! میں وہاں، ہسپتال کے بستر پر اجنبی لوگوں کے درمیان نہیں مرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا، جب میں آخری سانس لوں تو میرے اپنے میرے پاس ہوں۔ لیکن کل رات سے میں مسلسل ایک ہی بات سوچ رہا ہوں، مجھے زندہ رہنا چاہئے۔۔۔ تمکین کے لئے، اپنے بچے کے لئے۔ میں اگر نہ رہا تو ان کے لئے زندگی مشکل ہو جائے گی۔ پتہ نہیں کیا ہو جائے گا۔ میں نے کل جو جانا ہے، اس نے مجھے خوف میں مبتلا کر دیا ہے۔"

"کیا۔۔۔ کیا جانا ہے آپ نے۔۔۔؟" تمکین نے بے قراری سے پوچھا۔ لیکن افروز بس ایک نظر اس پر ڈال کر تسکین کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''میں ایک بار پھر کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ شاید کچھ دن، کچھ مہینے، کچھ سال مل جائیں۔ جب میں آیا تھا تو ڈاکٹرز کا بورڈ بیٹھا تھا، میرے کیس پر ڈسکس کرنے کے لئے۔ لیکن میں یہاں چلا آیا۔ میں انکل افضل سے رابطہ کرنے کے بعد پروگرام بناتا ہوں جانے کا۔''

''اس بار میں آپ کے ساتھ ہی جائوں گی۔'' تمکین نے کہا تو افروز نے سر ہلا دیا۔

''تمہیں اب دیر نہیں کرنی چاہئے افروز!'' تسکین نے اُس کے زرد چہرے کو دکھ سے دیکھا۔ کیا سوچا تھا انہوں نے اور کتنی خوش تھیں وہ کہ تمکین کو انہوں نے محفوظ ہاتھوں میں دے دیا ہے۔

''ہاں آپی! ان شاءاللہ! دو چار دن کا کام ہے میرا یہاں۔۔۔۔ پھر انکل سے بات کر کے پوچھتا ہوں کہ ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں۔ اگر کوئی وسیلہ ہے تو۔۔۔۔'' وہ تسکین سے بات کر رہا تھا اور تمکین اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد پڑے حلقے گہرے ہو گئے تھے۔ چہرہ بھی دُبلا ہو گیا تھا اور ہونٹ یوں سفید ہو رہے تھے، جیسے کسی نے ان میں سے خون کا آخری قطرہ تک نکال لیا ہو۔

''اتنے غور سے کیا دیکھ رہی ہو تمکین! یار، نظر نہ لگا دینا۔'' وہ ہولے سے ہنسا تھا۔

''نظر ہی تو لگ گئی تھی۔'' تمکین کی آنکھیں جھلملا گئیں۔ اُس نے ذرا سا رخ موڑ کر آنسو چھپانے کی کوشش کی تھی لیکن افروز نے دیکھ لیا تھا۔

''اوں، ہوں۔۔۔۔ اب رونا نہیں۔ پلیز۔۔۔۔ اس وقت میں تمہاری نم آنکھیں نہیں دیکھنا چاہتا۔ یاد ہے، آپی! آپ کو، بچپن میں بھی اس کا رونا مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا اور میں اسے خوش کرنے کے لئے کیسے کیسے ڈھونگ رچاتا تھا۔''

''ہاں۔'' آپی نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی۔ پتہ نہیں کیا کچھ یاد آیا تھا۔

''ابی جان بھی تمہاری طرح اس کے آنسو برداشت نہیں کر سکتے تھے، بے چین ہو جاتے تھے اور ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ لمحوں میں اس کی خواہش پوری کر دیں۔'' وہ ماضی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو یاد کر رہے تھے۔

عقیل بے حد سنجیدہ اور خاموش بیٹھا تھا۔

تمکین ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں ذرا ابوا کی مدد کر دوں۔''

''ہاں، کھانا ذرا جلدی لگوا دینا تمکین! مجھے ذرا عقیل کے ساتھ جانا ہے۔'' افروز نے اسے جاتے ہوئے آواز دی تو اس نے مڑ کر افروز کو دیکھا۔

''آپ ابھی تو آئے ہیں۔ تھکے ہوئے ہیں۔''

''لیکن ایک شخص سے ضروری ملنا ہے مجھے۔ وہ نو بجے کے بعد ہی ملے گا۔''

"تو کل مل لیجئے گا۔اس وقت آپ کو آرام کی ضرورت ہے افروز!"

"پتہ نہیں، کتنی مہلت ہے۔" وہ زیرِ لب بڑبڑایا تھا۔ تمکین اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"وہ اسی وقت مل سکتا ہے۔وہ تقریباً آٹھ بجے کے بعد ہی اپنے چیمبر میں آتا ہے۔ پلیز اب مت روکنا۔ضروری جانا ہے۔گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک آجائیں گے۔" اور تمکین نے مزید کوئی بات نہیں کی تھی۔

VVV

دوسرے دن بھی وہ ناشتے کے بعد ہی عقیل کی طرف چلا گیا تھا اور تقریباً عصر کے بعد واپس آیا تھا اور کچھ پُرسکون سا لگ رہا تھا۔

"آج میری افضل انکل سے بات ہو گئی ہے۔وہ میرے اس طرح چلے آنے پر بہت ناراض ہو رہے تھے اور انہوں نے مجھے فوراً واپس بلایا ہے۔"

"ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں وہ۔آپ کو اس طرح علاج ادھورا چھوڑ کر نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"شاید اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہو گی۔اگر میں نہ آتا تمو! تو کیسے جان پاتا۔۔۔کیسے علم ہوتا مجھے اس ظلم کا۔۔۔؟"

"کیسا ظلم، افروز؟" وہ پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

"کیا بتاؤں؟" اُس نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہیں یقین نہیں آئے گا۔مجھے بھی نہیں آرہا تھا۔ اگر ثبوت نہ ملتے تو ابھی بھی نہ آتا تمکین! میری بات دھیان سے سنو۔"

تب ہی بوا نے عقیل کے ابو اور عقیل کی آمد کا بتایا تو وہ بات ادھوری چھوڑ کر بیڈ روم سے باہر نکل گیا۔وہ بھی اس کے پیچھے ہی ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔وہ ان سے گلے مل رہا تھا۔ جبکہ عقیل، آپی سے کوئی بات کر رہا تھا۔ افروز سے گلے مل کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کیسی ہو بیٹی؟" اُنہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ افسردگی سے مسکرائی۔

"میں تو ٹھیک ہوں انکل!"

"پریشان مت ہو بچے!" انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "دعا کیا کرو، اللہ افروز کو صحت وزندگی دے۔میں ابھی اسلام آباد سے آیا ہوں۔کل آجاتا لیکن پھر ہری پور رُک گیا تھا، خدیجہ سے ملنے۔اور عقیل نے بتایا کہ تم یہاں ہو، اور۔۔۔۔"

وہ پھر افروز کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ تمکین، کچن میں چلی آئی کہ چائے بنا لے۔ بوا کو صبح سے فلو اور بخار تھا۔

چائے کے بعد وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی تھی۔ کمر میں درد ہو رہا تھا اور دل پر بڑا بوجھ سا تھا اور گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ آپی بھی اپنی وہیل چیئر پر اُس کے پاس آگئی تھیں۔ افروز، عقیل اور انکل ڈرائنگ روم میں ضروری گفتگو کر رہے تھے۔ آپی تاسف سے کتنی ہی دیر تک اسے دیکھتی رہیں۔

”تم ٹھیک تو ہو نا تمو؟“ انہوں نے پریشانی سے پوچھا۔

”بس، بہت گھبراہٹ ہے۔ جی چاہتا ہے زور زور سے رونا شروع کر دوں۔“

”تم نے پھر دوبارہ چیک اپ بھی نہیں کروایا۔ ڈاکٹر حلیمہ اس وقت اپنے کلینک پر ہی ہوں گی۔ بوا کے ساتھ چلی جاؤ۔“

”نہیں آپی! آج نہیں، کل چلی جاؤں گی۔“ اس نے جواب دیا۔

”پتہ نہیں، افروز کے ساتھ کیا ہوا ہو گا۔ کون جانے، کوئی امید کی کرن بھی تو نہیں ہے بس۔۔۔ اور اس بچے کی آمد بھلا ان حالات میں۔۔۔!“

”پلیز آپی!“ تمکین نے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ جیسے ان کے دل میں اُبھرتے خیالات کو جان گئی تھی۔

”نہیں، اس کا ہونا بہت ضروری تھا۔ بہت ضروری۔۔۔ آپ کو کیا پتہ آپی! اگر خدانخواستہ افروز نہ رہے تو یہ ہو گا، میرے جینے کا آسرا۔ میری زندگی کا جواز، افروز کی نشانی۔“ اُس نے دل ہی دل میں کہا تھا اور آنکھیں موند لی تھیں۔ تسکین نے اپنی وہیل چیئر بالکل اُس کے بیڈ کے قریب کر لی تھی اور پھر ہولے ہولے اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگی تھیں۔

VVV

”تمکین! تم کچھ لے نہیں رہی ہو۔“ شہر بانو نے تمکین کی طرف دیکھا جو اپنی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول ڈالے انہیں چمچ سے اِدھر اُدھر کر رہی تھی۔

”بس آپا! جی نہیں چاہ رہا۔“ اس نے بے دلی سے چمچ پلیٹ میں رکھ دیا۔

”ایسا کیسے چلے گا بٹیا! یہ چند نوالے لئے ہیں تم نے۔“ مہر بانو کے لہجے میں نرمی تھی۔ ”اس حالت میں تمہیں خود اپنی خوراک کا خیال رکھنا چاہئے۔“

"جی اماں!" تمکین نے سامنے بیٹھی مہر بانو کی طرف دیکھا۔ "خیال رکھتی ہوں، بس آج جی نہیں چاہ رہا۔"

اُس نے مہر بانو، شہر بانو اور پھر نادر خان کی طرف دیکھا، جو کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس نے فوراً نظریں اُس کی طرف سے ہٹالیں۔

ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ ٹیبل پر وہ سب اکٹھے ہوں۔ مہر بانو عموماً اپنے کمرے میں ہی کھانا کھاتی تھیں۔ لیکن آج سب تھے۔ اماں اور شہر بانو اس کے سامنے بیٹھی تھیں اور دائیں طرف والی چیئر پر نادر خان تھا۔ اور افروز، اُس کے لبوں سے بے اختیار سسکی نکلی۔ کتنی خاموشی کے ساتھ وہ اس منظر سے نکل گیا تھا۔ اور اب کبھی بھی اسے اس منظر کا حصہ نہیں بننا تھا۔ اس کے ساتھ والی کرسی ہمیشہ خالی رہے گی۔۔۔۔ ہمیشہ۔

اُس روز وہ پتہ نہیں کب سو گئی تھی۔ اُسے پتہ نہیں چلا تھا۔ وہ تو آنکھیں موندے، آپی کی انگلیوں کو اپنے بالوں میں حرکت کرتے محسوس کر رہی تھی۔ اور اسے بہت سکون مل رہا تھا۔ اور پھر پتہ نہیں کب نیند اُس کی آنکھوں میں اُتر آئی تھی اور پتہ نہیں کیوں، آج کل اسے اتنی نیند آتی تھی۔ حالانکہ وہ بہت زیادہ سونے کی تو کبھی بھی عادی نہیں رہی تھی۔ اور جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔

وہ ایک دم گھبرا کر باہر نکل آئی تھی۔ آپی لائونج میں اکیلی بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ بوا کچن میں تھیں۔

"افروز۔۔۔ افروز کہاں ہیں؟" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"وہ عقیل اور انکل کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔" تسکین نے بتایا تو وہ وہیں لائونج میں بیٹھ گئی۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"

"پتہ نہیں آپی! اتنا سونے کے بعد بھی عجیب سی بے چینی ہے۔"

"بوا جی!" تسکین نے آواز دی۔ "تمو کے لئے دودھ میں روح افزا ڈال کر لے آئیں۔"

"نہیں آپی! میرا جی نہیں چاہ رہا۔"

"گڑیا! تمہاری گھبراہٹ دور ہو جائے گی۔ اس سے تھوڑا سا لے لو۔"

"افروز نے کیا بتایا تھا؟ کب تک آئیں گے؟" اُس نے سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں کہا تھا۔ تمہارا پوچھ رہا تھا۔ میں نے بتایا کہ سو رہی ہے تو کہنے لگا میں انکل اور عقیل کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

بوا دودھ لے آئی تھیں۔ گھونٹ گھونٹ دودھ پیتے ہوئے وہ مسلسل افروز کے متعلق سوچتی رہی تھی۔

افروز کافی دیر سے آیا تھا اور اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔

"سوری آپی! مجھے ذرا بھی بھوک نہیں ہے۔ آپ لوگ پلیز کھانا کھالیں۔ میں آرام کروں گا۔ کچھ تھکاوٹ سی ہو رہی ہے۔"

"دودھ بھجوادوں افروز؟" آپی نے شفقت سے پوچھا۔

"نہیں آپی! پلیز کچھ بھی نہیں۔ اور ہاں، صبح میں عقیل کے ساتھ اسلام آباد اور پھر وہاں سے لاہور چلا جائوں گا۔ تمکین کے ویزے کا پتہ کرنا ہے اور اپنا بھی ٹکٹ وغیرہ کروانا ہے۔ اور پھر شوکت خانم سے چیک اپ

کرواناہے۔۔۔آپی! پلیز میرے لئے بہت دعا کریں کہ اللہ مجھے صرف چند سال اور زندگی کے دے دے، زیادہ نہیں، صرف چند سال۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے کہ میرے بعد کہیں۔۔۔۔"

"اللہ تمہیں بہت لمبی زندگی دے افروز! میرا تو رواں رواں تمہارے لئے دعا کرتا ہے۔ میرے اختیار میں ہو تو میں اپنی زندگی تمہیں دے دوں۔" اُن کی آواز بھرا گئی تھی۔ افروز محبت سے ان کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اور جب وہ کھانا کھا کر کمرے میں آئی تو وہ آنکھیں بازو پر رکھے سو رہا تھا۔

"افروز۔۔۔!" اُس نے آہستہ سے اُس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو افروز نے بازو ہٹا کر، آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"سوری افروز! میں نے آپ کو جگا دیا۔"

"نہیں، میں ابھی سویا نہیں تھا، سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ سر میں درد ہو رہا تھا۔"

"میں آپ کا سر دباتی ہوں۔"

وہ ہولے ہولے اس کا سر دبانے لگی تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہ جلد ہی سو گیا تھا۔ تمکین کو بہت دیر سے نیند آئی تھی۔ لیکن آدھی رات کو اچانک تمکین کی آنکھ کھل گئی۔ افروز گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

"افروز۔۔۔!" اُس نے گھبرا کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ افروز کی پیشانی پسینے سے تر ہو رہی تھی اور ہونٹ بالکل سفید ہو رہے تھے۔

"افروز۔۔۔!" اُس نے قدرے اونچی آواز میں اسے پکارا۔ افروز نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے تھے لیکن کچھ کہہ نہیں سکا تھا، بس بے بسی سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا تھا۔

"آپی۔۔۔!" وہ دروازہ کھول کر باہر کی طرف بھاگی۔ "آپی۔۔۔!"

"تمو۔۔۔!" افروز نے پوری طاقت صرف کر کے اسے آواز دی۔ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا تو افروز اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"افروز!۔۔۔افروز!" وہ اُس کے قریب آگئی۔

اُس کے ہونٹ ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ تمکین نے بہت غور سے سنا، وہ کہہ رہا تھا۔

"میرا وقت آگیا ہے شاید۔۔۔!"

"نہیں۔۔۔آپی!۔۔۔آپی۔۔۔!" وہ چیخی اور پھر چیختے ہوئے باہر نکل گئی۔

آپی اور بوا جاگ گئی تھیں۔ بوا نے فوراً ہی عقیل کو فون کیا تھا۔ آپی اس کے ساتھ ہی کمرے میں آئی تھیں۔

"افروز۔۔۔!" انہوں نے اُس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

تمکین رو رہی تھی اور بار بار اس کے لبوں سے نکل رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔نہیں افروز!۔۔۔آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔۔۔۔نہیں۔"

افروز نے آنکھیں کھول کر تسکین کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھوں میں بے بسی اور حسرت تھی۔ پھر عقیل، اُس کے ابو، امی سب ہی آ گئے تھے۔

''میں نے ایمبولینس کو فون کر دیا ہے۔ ہسپتال لے چلتے ہیں۔ڈاکٹر کو بھی میں نے احتیاطاً فون کر دیا ہے، آ رہے ہیں۔''

''افروز بیٹا! حوصلہ کرو۔'' ماموں اُس کا ہاتھ تھامے اُسے تسلی دے رہے تھے۔ لیکن وقت پورا ہو چکا تھا۔ اُس نے ایک ہچکی لی اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

''شاید۔۔۔شاید بی پی لو ہو گیا ہے۔ بوا! پلیز۔۔۔آپریٹس دیں۔'' عقیل نے بلند آواز میں کہا تھا۔ وہ ساکت بیٹھی تھی۔

''بی پی آپریٹس پر بی پی نہیں آ رہا تھا۔ ماموں جان نے افروز کی نبض پر رکھا ہاتھ اٹھا لیا۔ اور اب وہ عقیل سے کچھ کہہ رہے تھے لیکن اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے افروز کو

دیکھ رہی تھی۔ ماموں جان اس کے پاؤں سیدھے کر رہے تھے۔ انہوں نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھے تھے۔ وہ۔۔۔وہ دیکھ رہی تھیں، بغیر پلکیں جھپکائے۔

پھر پہلے بوا نے اسے گلے لگایا تھا لیکن وہ کسی پتھر کے بے جان مجسّمے کی طرح ان کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔

پتہ نہیں کتنی دیر وہ بے ہوش رہی تھی۔ جب ہوش آیا تو افروز کو پھلکوٹ لے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے بھی آ کر اس کی موت کی تصدیق کر دی تھی۔

اُس نے ایک گہری سانس لے کر پانی کا گلاس اٹھایا اور دو گھونٹ بھر کر رکھ دیا۔

''بس کھا چکیں۔۔۔؟'' اُسے اُٹھتے دیکھ کر مہر بانو نے پوچھا۔ ''یہ سُوپ تو چکھو، صرف تمہارے لئے بنوایا ہے میں نے۔''

''سوری آپا! اس وقت جی نہیں چاہ رہا۔ رات کو پی لوں گی۔'' اس نے معذرت کی۔

''شہر بانو! یہ تھوڑا سا سُوپ مجھے دے دو۔'' مہر بانو نے باؤل کی طرف ہاتھ بڑھایا تو شہر بانو نے بے اختیار باؤل کو اپنی طرف کر لیا۔

''نہیں اماں! یہ تمکین کے لئے تھا۔''

''تو۔۔۔؟'' مہر بانو نے بھنویں اچکائیں۔ ''اس نے نہیں پینا۔ اور اگر رات کو پیئے گی بھی تو کتنا پیئے گی۔ جانتی ہوں میں، کتنا کھاتی پیتی ہے وہ۔ مجھے روٹی کھانے کا جی نہیں چاہ رہا۔ تھوڑا سُوپ لے لیتی ہوں۔''

''نہیں اماں!'' شہر بانو نے باؤل کچھ اور اپنی طرف کھسکا لیا۔ ''اس میں نمک زیادہ ہے۔ آپ کا بی پی ہائی ہو جائے گا۔''

اب کی بار مہر بانو نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بس عجیب نظروں سے شہر بانو کو دیکھنے لگی تھیں۔ تب ہی نادر خان نے کھڑے ہوتے ہوئے سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی تھی۔

''میں آج ایبٹ آباد جارہا ہوں، کل آئوں گا۔''

''کیوں؟'' مہر بانو نے اس کی طرف دیکھا۔ ''صبح تو تم کہہ رہے تھے، ہفتہ بھر رہوں گا۔ دیکھو نادر خان! شہر بانو تمہاری بیوی ہے اور تم ہو کہ مہینے مہینے اس کی خبر نہیں لیتے۔''

''کام ہوتے ہیں اماں!'' اس نے ناگواری سے مہر بانو کی طرف دیکھا۔

''میں کہتی ہوں اب یہاں رہ کر کیا کرنا ہے۔ لاہور واپس چلیں۔''

''لاہور والے گھر میں کرائے دار رہتے ہیں۔'' نادر کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ باتیں تو وہ مہر بانو سے کر رہا تھا لیکن اس کی نظریں تمکین پر تھیں اور تمکین اندر ہی اندر اُلجھ رہی تھی۔ ڈسٹرب ہو رہی تھی۔

''تو کرائے داروں سے کہو گھر خالی کر دیں۔''

''دونوں پورشنز کا کرایہ اٹھارہ ہزار آتا ہے ہر مہینے۔''

''تو۔۔۔'' مہر بانو نے بھنویں اُچکائیں۔ ''یہ گھر کرائے پر دے دو۔''

''یہ گھر۔۔۔'' وہ ہولے سے ہنسا۔ ''اوّل تو یہ کرائے پر چڑھے گا نہیں، اس چھوٹے سے گائوں میں۔ اگر بالفرض محال کسی نے لے بھی لیا تو دو ہزار سے زیادہ کرایہ نہیں ملے گا۔''

''نہ ملے۔ ہم ایسے بھوکے ننگے تو نہیں ہیں کہ کرائے کے بغیر روٹی پانی نہیں ملے گا۔ جب لاہور میں رہتے تھے تب بھی تو کھاتے پیتے تھے۔'' مہر بانو کو اس طرح بحث کرتے تمکین پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

''تب کی اور بات تھی اماں!'' نادر خان نے جھنجلا کر کہا۔ ''تب عالم چچا زندہ تھے۔ وہ خرچ اٹھاتے تھے۔''

''تو اب کیا ساری دولت وہ اپنے ساتھ لے گیا؟ اتنی زمین، جائیداد، کاروبار۔ نادر! میں نے کہہ دیا ہے کہ اب میں اس ٹھنڈے سرد علاقے میں نہیں رہ سکتی۔ بہت رہ لیا۔''

''اماں! آپ بھی بس خوامخواہ ضد کئے جارہی ہیں۔'' شہر بانو نے آہستگی سے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''ہم لاہور کیسے جاسکتے ہیں؟ یہاں تمکین ہے، وہ اکیلی کیسے رہے گی؟ افروز سے وعدہ کیا تھا میں نے کہ اس کے بعد تمکین کا خیال رکھوں گی۔''

''میں رہ لوں گی آپا!۔۔۔ پلیز میرے لئے آپ پریشان نہ ہوں۔ میں بوا کو بلالوں گی یہاں۔''

''میں ضد کر رہی ہوں یا تم لوگوں کے دماغ میں فتور آگیا ہے۔'' مہر بانو کا موڈ سخت خراب تھا۔ وہ ایک دم اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

''اماں کا بی پی آج بہت ہائی ہے شاید۔'' مہر بانو نے تمکین اور نادر خان دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔ تمکین بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے سنا، نادر خان، شہر بانو سے کہہ رہا تھا۔

"اپنی اماں کو سمجھالو شہر بانو! بڑھی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔اور اس سے کہو اپنی زبان بند ہی رکھے، ورنہ۔۔۔"

تمکین نے اس کی بات کو حیرت سے سنا تھا۔

'یہ نادر خان کس قدر اجڈ اور جاہل لگتا ہے۔'

اپنے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے اس نے سامنے کلاک کی طرف دیکھا۔ابھی صرف تین بجے تھے۔آج صبح اس کی آنکھ کچھ دیر سے کھلی تھی، اس لئے وہ باہر نہیں جا سکی تھی۔ورنہ جب سے عدت کے بعد وہ واپس یہاں آئی تھی، ہر صبح وہ افروز کی قبر پر جاتی تھی۔گھر کی پچھلی طرف ایک مسطح قطعے پر دونوں قبریں ساتھ ساتھ بنی ہوئی تھیں۔افروز کے باباجان کی اور افروز کی۔وہ ہر صبح قبر کے پاس بیٹھ کر کچھ

سورتیں پڑھتی تھی اور پھر سورج نکلنے کے ساتھ واپس آجاتی۔

کتنا تھوڑا سا ساتھ تھا لیکن کتنے تھوڑے سے عرصے میں وہ اتنی یادیں چھوڑ گیا تھا، صبح سے شام تک اس کی کوئی نہ کوئی بات یاد کرتی رہتی تھی۔آپا نے کتنا چاہا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ واپس ایبٹ آباد چلی جائے، لیکن شہر بانو نے منع کر دیا تھا۔

"عدت گزار لے تو لے آنا۔"

آپی خاموش ہو گئی تھیں۔اور خود وہ کون سا جانا چاہتی تھی۔یہاں افروز تھا، اس کی یادیں تھیں، اس کی خوشبو تھی۔اس نے دل ہی دل میں سوچ رکھا تھا کہ وہ اپنی ساری زندگی یہاں، اسی گھر میں گزارے گی۔ایک بار پھر کسی سکول میں جاب کر لے گی، وقت گزاری کے لئے اور اپنے بچے کے ساتھ اسی گھر میں زندگی گزارنا تھی اسے۔

"عدت کے بعد لے جاؤں گی تمہیں، تمو!"

"آپی۔۔۔!" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ تسکین نے اسے ٹوک دیا۔

"تمہاری خواہشات اپنی جگہ درست ہیں تمکین! لیکن یہ خواتین تمہیں پسند نہیں کرتیں۔۔۔بالکل بھی نہیں۔ان کے ہر ہر انداز سے تمہارے لئے نفرت جھلکتی ہے۔مجھے ڈر ہے کہ یہ۔۔۔" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"عقیل نے بھی کہا ہے کہ تمہیں ایبٹ آباد لے آئوں، ڈلیوری کے بعد۔پھر سوچیں گے کہ تم نے آگے کیا کرنا ہے۔افروز نے بہت کچھ تمہارے اور بچے کے لئے چھوڑا ہے۔عقیل کے پاس سب کاغذات ہیں۔لیکن تمو! زندگی ایسے نہیں گزر سکتی۔"

"آپی پلیز!" وہ رو دی تھی۔تب انہوں نے اسے گلے لگا لیا تھا اور وہ ہولے ہولے سسکتی رہی تھی۔

"تم ان سارے دنوں میں اچھی طرح سوچ لینا، تمو! تم ہمیشہ یہاں نہیں رہ سکتیں۔بلکہ یہ لوگ تمہیں رہنے بھی نہیں دیں گے۔میں تو حیران ہوں، انہوں نے عدت تک تمہیں کیوں روکا۔"

لیکن وہ جانتی تھی،اسے کچھ نہیں سوچنا۔اس نے ہمیشہ کے لئے یہاں ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔اب یہی اس کا گھر تھا۔افروز نہیں رہا تھا،تب بھی اسے یہیں رہنا تھا۔وہ عدت کے بعد آپی سے ملنے ایبٹ آباد جائے گی تو سب بتادے گی۔

لیکن اسے عدت کے بعد ایبٹ آباد لے جانے کا کہنے والی آپی،افروز کی موت کے صرف دوماہ اور دس دن بعد اسے چھوڑ کر چلی گئیں۔بی پی تو ان کا اکثر شوٹ کر جاتا تھا لیکن اب کی بار انہیں شدید

ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور ہسپتال لے جاتے ہوئے راستے میں ہی ان کے دل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔عقیل کا فون آیا تھا۔

''آپی کی حالت سیریس ہے۔کسی طرح پہنچ جاؤ۔''

تب آپا اور دلبر کے ساتھ وہ ایبٹ آباد آئی تھی۔لیکن اس کی پیاری آپی،اس پر جان چھڑکنے والی آپی اسے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔وہ بوا کے گلے لگ کر تڑپ تڑپ کر روئی تھی۔ہفتوں روتی رہی۔ابھی تو افروز کی موت کا غم تازہ تھا اور آپی بھی چلی گئی تھیں۔

آپا دو دن بعد چلی گئیں۔بس وہ تھی اور بوا تھیں۔وہ تو جیسے اپنے آپ سے بیگانہ ہو گئی تھی۔بوا زبردستی کھلاتیں،کپڑے استری کر کے ہاتھ میں پکڑاتیں۔وہ تو جیسے بے جان مجسّمے میں بدل گئی تھی۔اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا تھا۔یہ کوئی آزمائش تھی،کسی کی غلطی کی سزا تھی۔۔۔۔کیا تھا؟۔۔۔۔خدیجہ چند دن اس کے پاس رہ کر گئی تھی۔کتنا ہی اسے سمجھاتی کہ یہی اللہ کی رضا تھی،لیکن اسے کچھ سمجھ نہ آتا۔وہ روئے چلی جاتی۔

آنٹی بھی ہر دوسرے تیسرے دن آتی تھیں۔انہوں نے بھی سمجھایا لیکن اس کا دکھ کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔سنبھلتے سنبھلتے بھی تقریباً دو مہینے گزر گئے تھے۔

'میں یہاں کیوں رہ رہی ہوں۔۔۔۔؟' اس نے خود سے پوچھا تھا۔

'مجھے تو پھلکوٹ میں ہونا چاہئے۔اپنے گھر۔۔۔۔!'

''بوا جی! میں اب گھر جاؤں گی۔'' اس نے ایک روز بوا سے کہا تھا۔

ان دو مہینوں میں آپا اور اماں نے ایک بار بھی فون نہیں کیا تھا۔اسے اب احساس ہوا تھا۔

''بوا! آپا یا اماں کا فون نہیں آیا؟''

''بٹیا! تم جب یہاں آئیں تو عدت میں تھیں۔تمہاری آپا کہہ گئی تھیں کہ اب عدت کے باقی دن تم یہاں ہی رہنا۔انہیں پسند نہیں تھا کہ عدت میں پھر تم گھر سے نکلو۔دو تین دن باقی ہیں تمہاری عدت میں۔چلی جانا۔''

''اچھا۔۔۔۔تب ہی عقیل اور انکل اِدھر نہیں آتے تھے۔''اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''ہاں بٹیا! باہر سے تو عقیل میاں روز ہی خیریت پوچھ کر جاتے ہیں۔''

''افروز۔۔۔۔'' اس نے سسکی لی۔''سب کچھ کتنی جلدی جلدی ہو گیا۔جولائی میں افروز کی بیماری کا پتہ چلا تھا،جب وہ کاغان سے واپس آئے تھے۔وہ زندگی سے کس قدر نااُمید تھا۔پھر اگست میں

لاہور میں اپنے آنگن میں کھلنے والے پھول کی خبر پا کر اس نے زندگی کی لگن ایک بار پھر اپنے اندر محسوس کی تھی۔ ستمبر۔۔۔اور پھر اکتوبر۔۔۔ صرف دو ماہ بعد وہ کتنی خاموشی سے چلا گیا تھا۔ یہاں، اسی گھر، اسی کمرے میں اس نے آخری سانس لی تھی۔ وہ اکتوبر کی آٹھ تاریخ تھی۔ اسے تو دوبارہ واپس امریکہ جانا تھا اور۔۔۔"

اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تو بوا نے اسے گلے لگا لیا تھا اور وہ کتنی ہی دیر ان کے گلے لگی، سسکتی رہی تھی۔

اگلی صبح اچانک ہی آپا، دلبر کے ساتھ آگئی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹی تھی، جب بوا نے اسے آپا کی آمد کا بتایا تھا۔ وہ ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

آپا آئی تھیں۔ آپا کو اس کا خیال تھا۔ آخر کو وہ ان کے سوتیلے بھائی کی بیوی تھی۔ اور افروز نے کیسے انہیں سگی بہنوں کا سامان دے رکھا تھا۔

آپا لائونج میں بیٹھی تھیں۔ وہ بے اختیار ان کی طرف بڑھی تھی۔ لیکن آپا تو حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"یہ۔۔۔؟" انہوں نے اس کی طرف اشارہ کیا تو بے حد گھبرا کر اس نے دوپٹہ اچھی طرح اپنے گرد پھیلا لیا۔

"یہ۔۔۔!" آپا اتنا حیران سی کھڑی تھیں کہ اس سے ملنا بھی بھول گئیں۔

"اور تم نے ذکر تک نہیں کیا۔" اُن کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں سی پڑی تھیں۔ "اور نہ ہی افروز نے۔۔۔ ہم کوئی تمہارے دشمن تھے؟ خوشی ہی ہوتی۔ اماں بے چاری تو ہر لمحہ کڑھ کڑھ کر مرتی رہیں کہ ان کے چچا کا نام و نشان باقی نہ رہا۔"

"وہ، آپا! بس، افروز کی بیماری۔۔۔" وہ شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

"اب بھی کا ہے کو پتہ چلنا تھا اگر جو میں نہ آتی تو۔۔۔"

"نہیں آپا!۔۔۔ مجھے آنا تو تھا، ایک دو روز تک۔ آخر کب تک یہاں رہتی؟ مڑ کر اپنے گھر ہی آنا تھا۔"

"اپنا گھر۔۔۔" وہ عجیب سی ہنسی ہنسی تھیں۔ وہ ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگی۔ تب بوا نے نرمی سے کہا۔

"بٹیا! اتنی کم عمری۔۔۔ یک دم دو صدمے۔ بٹیا کی تو حالت ہی خراب تھی۔ کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ دو چار دن ہوئے سنبھلی ہے تو میں نے ہی کہا کہ چند دن رہ گئے عدت پوری ہونے میں، پھر چلی جانا۔"

آپا کا موڈ کافی حد تک بے حد خراب رہا تھا۔

"میں تو آئی تھی کہ پتہ کروں کہ افروز نے تمہارے نام بھی کچھ کیا ہے۔ پہاڑ سی زندگی کیسے گزرے گی۔ سنا ہے، امریکہ والے پنشن و نشن بھی دیتے ہیں، بیوہ کو؟"

"افروز نے تو جاب چھوڑ دی تھی شاید۔ لیکن مجھے کچھ علم نہیں۔ عقیل بھائی کو پتہ ہو گا۔"

"تو عقیل نے اتنے دنوں میں آ کر نہیں بتایا تمہیں؟" آپا کا انداز ہنوز وہی تھا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو بٹیا؟ تمکین بیٹی تو عدت ہیں تھی۔ عقیل بھلا کیسے آتا؟"

"اوہ، ہاں۔۔۔۔ اچھا۔"

وہ کچھ دیر بعد چلی گئی تھیں۔ تمکین اُن کے روّیے پر حیران ہوتی رہی تھیں۔

"کیا آپا نہیں چاہتیں کہ میں وہاں آئوں؟" اس نے بوا سے پوچھا تھا۔

"سچ تو یہ ہے کہ تم نے اب وہاں جا کر کرنا بھی کیا ہے۔ وہاں کون ہے تمہارا؟ وہ، جس سے رشتہ تھا، وہی نہیں رہا تو۔۔۔۔ میں تو کہتی ہوں، اپنا سامان لے کر یہاں ہی آجائو۔ میں جب تک ہوں، تمہارے ساتھ ہوں۔ آس پاس سب برسوں سے جاننے والے ہیں۔"

"لیکن بوا! وہ میرا گھر ہے۔ افروز کہتے تھے، وہ اسے میرے نام کر دیں گے۔ اور مجھے تو وہاں ہی رہنا ہے ہمیشہ، اپنے بچے کے ساتھ۔"

"بڑی لمبی حیاتی ہے پتر!" بوا ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں۔

عقیل اور انکل بھی اس کے وہاں اکیلا جا کے رہنے کے حق میں نہیں تھے۔

"بہتر ہے کہ اپنا سامان وغیرہ لے کر واپس آجائو۔" انکل نے کہا تھا۔ "عقیل اور بوا تمہارے ساتھ چلے جائیں گے۔ ایک دن رک جائو مزید تو۔۔۔۔"

وہ خاموش رہی تھی۔

چار ماہ دس دن گزر گئے تھے، افروز کے بغیر، کتنے چپکے اور خاموشی سے۔ اور اب رات کو عقیل نے آکر اسے بہت سارے کاغذات دیئے تھے۔ بینک کے کاغذات، پھلکوٹ والے کاٹیج کی ملکیت کے کاغذات، اور بھی جانے کیا کیا تھا۔

"تمو! دیکھ لو سب۔"

لیکن اُس کی آنکھوں کے آگے تو دُھند چھا رہی تھی۔ جب افروز اس سے مختلف کاغذات پر دستخط کروا رہا تھا، وہ کتنا چڑی تھی۔

"یہ ضروری ہے تمو!"

"یہ فائل آپ اپنے ہی پاس رکھیں عقیل بھائی!"

"میرا خیال ہے تم یہ لاکر میں رکھوا دو۔ صبح میرے ساتھ بینک چلنا۔ لاکر لے لیں گے۔ یہاں گھر میں بھی اگر کچھ ایسا ہے تو لاکر میں رکھ دو۔ آپی کی جیولری اور۔۔۔۔ اور جب تک تم پھلکوٹ میں ہو، بوا ہمارے گھر رہیں گی تو گھر بند رہے گا۔ جلد یا بدیر تمہیں واپس آنا ہی ہوگا۔ تمو! میں نہیں سمجھتا کہ وہاں تمہارا رہنا مناسب ہوگا۔ اگر افروز کو کچھ مہلت مل جاتی تو وہ بھی شاید تمہیں وہاں رہنے سے منع کر دیتا۔"

"اگر میرے لئے وہاں رہنا مشکل ہوا تو میں واپس آجائوں گی، عقیل بھائی!" اُس کی آواز بھرا گئی تھی۔

اور اگلے روز جب وہ بینک سے واپس آئی تو آپا آئی ہوئی تھیں۔

"میں تمہیں لینے آئی ہوں تمکین!"

آج اُن کا روّیہ سراسر بدلا ہوا تھا۔ وہ بہت محبت اور گرم جوشی سے ملی تھیں اور اس کے بچے اور اس کی صحت کے لئے تشویش کا اظہار کیا تھا۔ پھر وہ ان کے ساتھ واپس آ گئی۔ اپنے بیڈ روم میں آکر کتنی ہی دیر تک وہ ساکت بیٹھی رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے سے کتنے ہی منظر گزر گئے تھے۔

افروز ٹیرس پر کھڑا تھا۔ بیڈ پر بیٹھا اُسے حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ نماز پڑھتے ہوئے دعا مانگ رہا تھا۔ وہ دونوں اپنے اپنے پسندیدہ شعر ایک دوسرے کو سنا رہے تھے۔ کارڈز کھیلتے ہوئے ہنس رہا تھا۔ اُسے لگا جیسے وہ تنہا نہیں ہے، بلکہ افروز بھی ہے اُس کے آس پاس کہیں خوشبو کی طرح۔ نظر نہیں آ رہا تھا، لیکن محسوس ہو رہا تھا۔ وارڈ روب میں اُس کے کپڑے اس طرح ہینگروں میں لٹکے ہوئے تھے۔ جوتے ریک پر پڑے تھے۔ ابھی تک واش روم میں اُس کا آفٹر شیو لوشن اور شیونگ کریم پڑی تھی۔ افروز کے بعد جو دو ماہ دس دن وہ یہاں رہی تھی، اس نے کسی بھی چیز کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹایا تھا اور اب بھی سب ویسا ہی تھا۔ اس کے بعد بھی شاید کسی نے اس کے کمرے کو نہیں چھیڑا تھا۔ گو، لندن بی بی نے بتایا تھا کہ دو تین بار اس نے صفائی کی تھی کمرے کی۔ لندن بی بی سے ہی اسے پتہ چلا کہ آپا اور مہر بانو اس کے ایبٹ آباد جانے کے بعد لاہور چلی گئی تھیں اور ہفتہ بھر پہلے ہی واپس آئی تھیں۔ آپا نے تو کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔

وہ وارڈ روب کا پٹ تھامے کتنی ہی دیر تک اس کے کپڑوں کو دیکھتی رہی تھی۔ چھو چھو کر محسوس کرتی رہی۔ کتنا مختصر ساتھ تھا لیکن کتنی بے شمار یادیں تھیں۔

"افروز۔۔۔۔" اس نے سسکی لی تھی۔

یہاں ہر چیز ایسی ہے، کوئی موسم نہیں بدلا

تیرا کمرا ابھی ویسا ہی پڑا ہے، جس طرح تُو نے

اسے دیکھا تھا۔۔۔۔ چھوڑا تھا

تیرے بستر کے پہلو میں رکھی میز پر

اب بھی دھرا ہے کپ وہ کافی کا

کہ جس کے خشک اور ٹوٹے کناروں پر

ابھی تک وسوسوں اور خواہشوں کی جھاگ کے

دھبے نمایاں ہیں

تیرے چپل بھی رکھے ہیں

کہ جن کے بے ثمر تلوؤں سے وہ سب خواب لپٹے ہیں

جو انتار وندے جانے پر بھی اب تک سانس لیتے ہیں

تیرے کپڑے جو غم کی بارشوں میں دُھل کے آئے ہیں

میری الماری کے ہینگروں میں اب بھی لٹکے ہیں

دلاسوں کا وہ گیلا تولیہ

اور ہچکیوں کا وہ ادھ گھلا صابن

چمکتے واش بیسن پر پڑے ہیں

سب کچھ ویسا ہی ہے، لیکن تم نہیں ہو

وہ بہتے آنسوئوں کے ساتھ وارڈروب کے پاس سے ہٹ آئی تھی۔ اور پھر شام کو ہی وہ افروز کی قبر پر گئی تھی۔

ان دس دنوں میں یہ اس نے اپنا معمول بنالیا تھا اور یہاں آنے کے پانچ دن بعد وہ واقعہ پیش آگیا تھا۔

'شاید میرا وہم ہی ہوگا۔ بھلا ایک اجنبی شخص کو مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ وہ لوئی والا شخص پتہ نہیں کون تھا۔ شاید یوں ہی وہاں آگیا ہو اور میں پاگلوں کی طرح خوف زدہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ خدانخواستہ اگر کچھ نقصان ہو جاتا تو۔'

اُس نے وحشت سے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔

'پتہ نہیں وہ کیسا ہوگا۔۔۔ افروز کی طرح، یا میرے جیسا؟ اور اللہ کا کرم ہے کہ یہ ہے میرے پاس، افروز کی نشانی۔ آپا صحیح کہتی ہیں کہ مجھے ایک بار چیک اپ کروالینا چاہیئے۔ لیکن نادر بھائی واپس چلے گئے تو میں لندن بی بی کے ساتھ چلی جائوں گی۔ اور نادر بھائی۔۔۔!'

اُس نے خوف سے جھرجھری سی لی اور ٹیرس کے کھلے دروازے سے سامنے ڈاک بنگلے کے ٹیرس کی طرف دیکھا۔ ٹیرس خالی تھا۔

'میں بھی۔۔۔' اُس نے ہولے سے سر کو جھٹکا۔ 'اب وہ اتنا فارغ بھی نہیں ہوگا کہ ہر وقت ٹیرس پر ہی نظر آئے۔'

وہ اُٹھ کر ٹیرس پر آئی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ مارچ کا مہینہ تھا، بہار کی آمد۔ میدانوں میں تو بہار پوری طرح جلوہ گر ہوگی، لیکن یہاں ابھی سامنے پہاڑوں پر سفید برف چمکتی تھی اور اسے وہاں ٹیرس پر کھڑے کھڑے ابھی بھی خنکی سی محسوس ہوتی تھی۔

کھڑے کھڑے اُسے کمر میں درد محسوس ہوا تو وہ واپس بیڈ پر آکر لیٹ گئی۔ دو تین دن سے کبھی کبھی یکایک کمر میں درد کی لہر سی اُٹھتی تھی۔ ڈاکٹر نے اپریل کا لاسٹ وِیک بتایا تھا اور ابھی مارچ کا وسط تھا۔

'پتہ نہیں، نادر خان کب واپس جائے گا۔ میں صبح لندن بی بی کے ساتھ ادھر دو میل میں جا کر نہ دکھا آئوں۔ لندن بی بی کہہ رہی تھی کہ بہت سیانی ہیلتھ وزیٹر ہے، زمرد باجی۔'

اُس نے سوچا اور آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

VVV

"آپا! میں سوچ رہی ہوں، ایبٹ آباد جانے کے بجائے زمرد باجی کو چیک کروالوں۔" صبح ناشتہ کرتے ہوئے اس نے شہر بانو سے پوچھا۔

شہر بانو نے چونک کر نادر خان کی طرف دیکھا تو اس نے سر ہلا دیا۔ نادر خان رات کو ہی واپس آیا تھا۔

"جیپ لے جانا۔ مجھے تو کچھ کام ہے۔ دلبر کو لے جانا ساتھ۔ دلبر بھی اب اچھی خاصی ڈرائیونگ کر لیتا ہے۔"

تمکین نے سکون کی سانس لی تھی۔ اور اگر نادر خان ساتھ جانے کو کہتے بھی تو وہ انکار کر دیتی۔

پہلی بار تھی کہ وہ اتنے دنوں کے لئے آیا تھا۔ آج ناشتے پر صرف وہ تینوں ہی تھے۔ اماں نے ناشتہ اپنے کمرے میں ہی کیا تھا۔ وہ ناشتہ کر کے اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ کچھ دیر تک اپنی اور افروز کی شادی کی تصویر کو دیکھتی رہی۔

کبھی کبھی خوشیاں کتنی تھوڑی مدت کے لئے انسان کی زندگی میں آتی ہیں۔

پلکیں نم آلود ہو گئیں تو وہ تصویر کے پاس سے ہٹ آئی۔ کچھ دیر بعد تیار ہو کر وہ نیچے آئی تو لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ دلبر اور لندن بی بی اس کے ساتھ جانے کو تیار تھے۔

"آپا کہاں ہیں؟"

"صاحب اور بیگم صاحب کہیں باہر چلے گئے ہیں۔ وہ کہہ گئے تھے کہ آپ چلی جائیں۔"

"اچھا۔" وہ اچھی طرح اپنے گرد چادر لپیٹتی ہوئی باہر نکلی۔ باہر جیپ کے پاس ہی وہ کھڑا تھا۔ وہی، ریسٹ ہاؤس والا۔ ایک ہاتھ جیپ پر رکھے وہ آنکھوں سے دُور بین لگائے کہیں سامنے دیکھ رہا تھا۔

"سلام صاحب!" دلبر نے اسے سلام کیا تو اس نے دُور بین آنکھوں سے ہٹا کر ان کی طرف دیکھا۔ یکایک اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ دلبر کے سلام کا جواب دے کر اب وہ تمکین کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"جی، ٹھیک ہوں۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہوا؟"

"نہیں، میں کبھی گھر سے باہر ہی نہیں نکلی۔"

"ویسے یہاں تو سب ہی لوگ مخلص اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ شاید آپ کا وہم ہی ہو۔"

"شاید۔۔۔" وہ اب دلبر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اوہ سوری۔۔۔ آپ لوگ شاید کہیں جا رہے تھے اور میں نے۔۔۔"

"جی صاحب!" دلبر نے جیپ کا دروازہ کھولا۔

""تم پھر نہیں آئے یار؟"" اب وہ دلبر کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

""آج آئوں گا، ماما سے ملنے۔""

""اوکے۔۔۔۔پھر شام میں گپ شپ لگے گی۔"" اس نے ایک نظر خاموش کھڑی تمکین کو دیکھا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سڑک کراس کرنے لگا۔

تمکین نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔ کمر میں اب بھی ہلکی ہلکی، درد کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔

'مجھے اتنی بے پروائی نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ لیکن نہ آپی رہیں، نہ افروز۔ کون تھا جو میرا خیال رکھتا۔ زبردستی مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا؟'

بند آنکھوں میں نمی سی پھیل گئی۔

'اب میں ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اپنا بہت خیال رکھوں گی۔' اُس نے دل ہی دل میں عہد کیا تھا۔

""دیکھو تمو۔۔۔۔! تمہیں اپنا بہت خیال رکھنا ہے۔ بہت زیادہ۔ اپنے لئے بھی اور اس کے لئے بھی۔ کاش! میں اسے دیکھ سکتا۔ پتہ نہیں وہ کیسا ہو گا یا کیسی ہو گی؟""

ایک روز افروز نے اس سے وعدہ لیا تھا اور اس نے افروز سے کیا وعدہ پورا کیا تھا۔ ایبٹ آباد میں تھی تو بوا زبردستی اسے وقت بے وقت کچھ نہ کچھ کھلاتی رہتی تھیں۔ دو ایک بار ڈاکٹر حلیمہ کو بھی گھر لے کر آئی تھی،

چیک کروانے کے لئے۔ اور یہاں کون تھا اُس کا خیال رکھنے والا۔ کبھی کبھی تو وہ پورا پورا دن کچھ نہیں کھاتی تھی۔

'سوری افروز! اب ایسا نہیں ہو گا۔'

یکایک وہ اُچھل پڑی۔

""کیا ہوا؟"" اُس نے دلبر سے پوچھا۔

""پتہ نہیں۔"" دلبر نے گھبرا کر بریک لگانے کی کوشش کی تھی۔ اُس نے ٹائر کو لڑھک کر کھائی میں گرتے دیکھا تھا اور خوف سے آنکھیں موند لی تھیں۔

'شاید آخری وقت آگیا ہے۔'

ایک طرف کھائی تھی اور دوسری طرف اونچے پہاڑ۔

""بریک بھی کام نہیں کر رہے۔"" اُس نے دلبر کی بڑبڑاہٹ سنی تھی۔ اور پھر لندن بی بی نے مضبوطی سے اُس کا بازو پکڑا تھا۔

وہ دل ہی دل میں کلمہ پڑھنے لگی تھی۔۔۔۔ جب دلبر کی آواز سنائی دی۔

""خدایا! شکر ہے۔""

اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ جیپ رک گئی تھی۔

دلبر نے تیزی سے نیچے اُتر کر بڑا سا پتھر گھسیٹ کر جیپ کے نیچے رکھا۔

"یہ کیسے ہوا؟" وہ اور لندن بی بی بھی اُتر آئی تھیں۔

"پتہ نہیں۔"

یہ افروز کی جیپ تھی اور بالکل نئی تھی۔ افروز کے بعد اب اسے نادر خان استعمال کرتا تھا اور کل بھی تو وہ ایبٹ آباد گیا تھا۔

"تم نے چیک نہیں کی تھی جیپ؟"

"نہیں۔" دلبر شرمندہ ہوا تھا۔ "صاحب نے کہا تھا سب ٹھیک ہے۔"

ابھی وہ یہاں کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کریں کہ پھلکوٹ کی طرف سے ایک جیپ آتی دکھائی دی، جو ذرا فاصلے پر رک گئی تھی۔ اور پھر اس میں سے دانیال مرزا اُتر کر قریب آگیا۔

"خیریت۔۔۔۔؟"

دلبر نے اُسے تفصیل بتائی تو اُس نے قریب آکر گاڑی کا جائزہ لیا۔ بریک چیک کئے اور معنی خیز انداز میں سر ہلاتا ہوا اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"لگتا ہے قسمت آپ پر بہت ہی مہربان ہے، میم! ورنہ تو جس طرح۔۔۔۔ خیر، اللہ کا شکر ادا کریں۔ گھر جا کر کچھ صدقہ وذقہ دے دیں۔ اور پلیز، آپ کہاں جا رہی ہیں؟ میں آپ کو پہنچا دیتا ہوں۔"

"آپ کہاں جا رہے ہو صاحب؟ بڑی مہربانی ہو گی، ہم کو بھی لے جاؤ تو۔" تمکین کے بجائے لندن بی بی نے جواب دیا۔

"میں جا تو ایبٹ آباد رہا ہوں، لیکن آپ کو جہاں جانا ہے، وہاں پہنچا دوں گا۔"

"ہمیں تو صاحب! دو میل جانا ہے، زمرد باجی کے ہسپتال تک۔ بس وہاں اتار دینا۔"

تمکین خاموش کھڑی تھی۔

"آیئے پلیز!"

تمکین نے ایک نظر دلبر کی طرف دیکھا۔

"آپ جائیں بی بی! میں اِدھر جیپ کا کچھ کرتا ہوں۔"

"اسپیئر وہیل تو ہو گا؟" تمکین کو خاموش دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"جی صاحب! لیکن آپ نے تو ادھر سے ہی جانا ہے۔ امارا بی بی کو لے جاؤ۔ ہم جیپ لے جائے گا۔ ہم اب بی بی کو نہیں لے کر جائے گا اس جیپ میں۔۔۔۔ ڈر گیا ہے ام۔"

"پلیز، آپ کیا سوچ رہی ہیں؟۔۔۔۔ میں کوئی ڈاکو لٹیرا نہیں ہوں، ایک معزز شخص ہوں۔"

"آجاؤ بی بی صاحب!" لندن بی بی نے بھی کہا تو وہ خاموشی سے جیپ میں بیٹھ گئی۔

"میں۔۔۔۔" جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے ذرا سامڑ کر پیچھے دیکھا۔ "میرا نام دانیال مرزا ہے۔ میں یہاں چلغوزوں پر تحقیق کرنے آیا ہوں۔ پہلے بھی کچھ لوگ آئے تھے۔ چلغوزوں کے درخت تیزی سے ضائع ہو رہے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے اور کیا ہم ان درختوں میں اضافہ کر سکتے ہیں؟ ایک خاص قسم کا کیڑا لگ رہا ہے ان کو۔"

تمکین نے صرف سر ہلا دیا۔

خدا نے واقعی کرم کیا تھا۔ لیکن کیا قسمت اس پر مہربان تھی؟ اگر ایسا ہوتا تو افروز کیوں جاتا؟ آپی بھی یوں اسے تنہا چھوڑ کر نہ جاتیں۔ وہ سوچ رہی تھی۔

اُسے خاموش دیکھ کر دانیال مرزا بھی خاموش ہو گیا تھا۔ دو میل پہنچ کر اُس نے لندن بی بی سے زمرد باجی کے ہسپتال کا پوچھا۔

"بس جی، ہمیں یہاں ہی اُتار دو اڈے پر، ہم چلے جائیں گے۔ آپ اپنا راہ کھوٹا نہ کرو۔" لندن بی بی نے کہا تو تمکین نے اپنی چادر کو اچھی طرح لپیٹا۔

"پلیز راستہ بتائیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اُس نے بے حد سنجیدگی سے کہا تو لندن بی بی اُسے راستہ سمجھانے لگی۔

"شکریہ۔ آپ کو زحمت ہوئی۔" جیپ سے اتر کر تمکین نے آہستگی سے کہا۔

"مجھے بالکل زحمت نہیں ہوئی، میم! میں نے یہاں سے ہی گزرنا تھا۔" ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا۔ "اور مجھے اس طرح کی فارمیلٹیز بالکل پسند نہیں۔ میں بہت بے تکلف بندہ ہوں۔" وہ جیپ کی طرف مڑ گیا۔

زمرد باجی واقعی بہت تجربے کار تھی اور بہت اخلاق سے پیش آئی تھی۔

"سب ٹھیک ہے بی بی! گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہر چیز نارمل ہے۔ یہ کچھ دوائیں باقاعدگی سے استعمال کرو۔ ان شاءاللہ سب خیریت ہو گی۔"

جب وہ اس ایک کمرے کے ہسپتال سے باہر نکلیں تو دانیال مرزا کی جیپ وہیں کھڑی تھی۔ انہیں آتے دیکھ کر وہ جیپ سے نکل آیا۔

"آیئے پلیز!" اس نے دروازہ کھولا۔

"آپ ایبٹ آباد نہیں گئے؟" تمکین کو حیرت ہوئی۔

"نہیں۔۔۔۔ میرا ارادہ بدل گیا تھا۔ واپس جا رہا تھا تو خیال آیا کہ آپ نے بھی جانا ہو گا، لیتا چلوں۔"

"آپ نے خوامخواہ۔۔۔۔" تمکین نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے ٹوک دیا۔

"میں نے کوئی زحمت نہیں کی۔ پلیز بیٹھیں۔"

VVV

آپالاؤنج میں ہی بیٹھی تھیں لیکن ان کا موڈ خراب تھا۔

دلبر نے واپس آکر تفصیل بتادی تھی لیکن انہوں نے تمکین سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ہاں،مہر بانو جو اسی وقت اپنے کمرے سے باہر نکلی تھیں،انہوں نے تمکین کی طرف دیکھا۔

''تم ڈاکٹر کی طرف گئی تھیں۔کیا کہا اُس نے؟''

''کیس نارمل ہی ہے۔کوئی پریشانی والی بات نہیں۔''

''میں تو کہتی ہوں،اگلے مہینے تم ایبٹ آباد ہی چلی جائو۔وقت بے وقت ہسپتال جانا پڑا تو یہاں سے تو مسئلہ بن جائے گا۔وہاں افروز کے ماموں کا گھر ہے،وہاں رہ لینا۔اپنی بوا کو بلوا لینا۔یا پھر اپنے گھر میں ہی بوا کے ساتھ رہ لو۔''

''اماں!آپ بھی ہمیشہ الٹی باتیں کرتی ہیں۔کبھی جو سوچ کر کوئی بات کی ہو۔'' شہر بانو نے غصے سے کہا۔

''تو کیا غلط کہا ہے میں نے؟'' مہر بانو اب شہر بانو کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''صحیح بھی نہیں اماں!آپ خوامخواہ مشورے نہ دیا کریں۔ڈاکٹر نے ڈیٹ بتا رکھی ہے۔ایک دن پہلے جائیں گے ایبٹ آباد۔پھر جیپ گھر میں موجود ہے،دلبر ہے۔کوئی مسئلہ اچانک ہو گیا تو جا سکتے ہیں۔پرائے گھر جا کر رہنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''پرایا گھر کیوں؟'' مہر بانو نے چڑ کر کہا۔''افروز کے ماموں کا گھر ہے۔تجھ سے زیادہ ہمدرد ہوں گے اس کے،پھر۔۔۔۔''

''بس اماں!آپ تو سٹھیا گئی ہیں۔'' شہر بانو کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔

''اماں!آپ پریشان نہ ہوں۔'' تمکین نے،جو اس دوران خاموش کھڑی تھی،مہر بانو کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا۔''جب مجھے لگا کہ یہاں مسئلہ ہو سکتا ہے تو میں چلی جاؤں گی۔اور پھر شکیل ماموں کا گھر میرے لئے ہرگز پرایا نہیں ہے۔میں بچپن سے اس گھر میں کھیل کود کر بڑی ہوئی ہوں۔''

مہر بانو سے بات کر کے وہ شہر بانو کی طرف دیکھنے لگی تھی۔شہر بانو نے اب کی بار کچھ نہیں کہا تھا اور ایک غصیلی نظر مہر بانو پر ڈال کر لاؤنج سے باہر نکل گئی تھی۔

''یہ لڑکی بھی۔۔۔۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کب اور کیا کرے گی یہ۔'' مہر بانو بھی بڑبڑاتے ہوئے اس کے پیچھے ہی نکل گئیں۔

تمکین وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔وہ فی الحال فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔آیا وہ یہاں رہے یا ایبٹ آباد چلی جائے۔۔۔۔عقیل اور خدیجہ بھی اسے ایبٹ آباد آنے کے لئے کہہ چکے تھے۔لیکن اس کا دل

نہیں مانتا تھا۔ یہاں اس گھر میں، اس کے بیڈ روم میں جگہ جگہ افروز کی یادیں تھیں، اس کے ہونے کا احساس ہوتا تھا۔۔۔ جیسے وہ اس کے آس پاس، ارد گرد ہی کہیں موجود ہو۔

’خیر، ابھی تو مارچ ہے۔ اپریل شروع ہوتے ہی ایبٹ آباد چلی جائوں گی۔‘

یوں بھی ڈاکٹر نے اسے پندرہ اپریل کی ڈیٹ دی تھی۔ وہ مطمئن سی ہو کر ٹی وی دیکھنے لگی۔

VVV

’افروز۔۔۔!‘ اُس نے اپنے ہاتھ اُس کی قبر پر رکھے۔ ’’مجھے آپ کی بہت ضرورت ہے افروز! ہر آن، ہر لمحہ۔۔۔‘

اُس کی پلکوں پر ستارے سے ٹمٹمانے لگے۔ لیکن اس نے ہاتھوں کی پشت سے فوراً پلکیں صاف کر لیں۔

’نہیں۔۔۔ افروز نے کہا تھا، تمو! میرے بعد رونا نہیں۔ میری روح کو تکلیف ہو گی۔‘

کچھ دیر وہ یونہی نچلا لب دانتوں تلے دبائے ہولے ہولے قبر پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ پھر دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیئے۔ دعا مانگ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ حالانکہ واپس جانے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا

تھا۔ دل پر گھبراہٹ سی طاری تھی۔ فضا میں موجود خنکی اسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ کچھ دیر اور رک جائے، یا پھر تھوڑا اور اونچائی پر جا کر فضا کی ساری ٹھنڈک اور خنکی اپنے اندر اُتار لے۔

اُس نے چند قدم اوپر جانے کے لئے بڑھائے، پھر رک گئی۔ وہاں سے اسے وہ ٹوٹا ہوا ہٹ نظر آ رہا تھا، جہاں آخری بار اس نے افروز کے ساتھ بیٹھ کر سورج کو ڈوبتے دیکھا تھا۔ اس کا یکایک جی چاہنے لگا کہ وہ وہاں جائے اور کچھ دیر وہاں بیٹھے۔ اس نے مڑ کر گھر کے پچھلے دروازے کی طرف دیکھا، جہاں سے نکل کر وہ قبرستان تک آئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اسے گمان ہوا تھا کہ کوئی دروازے سے باہر آیا ہے۔ شاید دلبر یا لندن بی بی۔۔۔ کبھی جب وہ دیر تک یہاں بیٹھی رہتی تھی تو وہ بلانے آ جاتے کہ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ لیکن کوئی نہیں تھا۔ دروازہ اسی طرح بند تھا جس طرح وہ چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ پھر مڑ کر اس ہٹ کو دیکھنے لگی۔

’’ذرا ٹھہر جا اسی موڑ پر، تیرے ساتھ شام گزار لوں۔‘‘

افروز کی گمبھیر اُداس آواز جیسے اُس کے کانوں میں گونجی۔

وہاں بیٹھے بیٹھے اس نے یہ شعر سنایا تھا۔

وہ بے اختیار آگے کی طرف بڑھی۔ نیچے اترنے کے بجائے وہ وہیں سے ایک طرف اوپر جانے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اوپر اوپر سے ہی چلی جائے گی۔ چلتے چلتے وہ رک گئی اور ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرف جائے کہ اس ہٹ تک پہنچے۔

اچانک کسی نے اسے پیچھے سے پوری طاقت سے دھکا دیا۔۔۔چونکہ وہ بے دھیان سی کھڑی تھی، اسی لئے توازن برقرار نہ رکھ سکی اور نیچے گرنے لگی۔ غیر ارادی طور پر اس کے حلق سے چیخیں نکل رہی تھیں۔ اُس کے ساتھ پتھر بھی لڑھک رہے تھے۔ آخری بات جو اُس نے محسوس کی تھی، وہ خون کی چپچپاہٹ تھی۔۔۔۔ اُس کی کنپٹی میں شاید کسی پتھر کا نوکیلا کونا چبھا تھا۔ اُس نے جسم کی پوری طاقت کے ساتھ مدد کے لئے پکارا اور پھر جیسے سب کچھ نظروں کے سامنے سے معدوم ہو گیا تھا۔

'پھر۔۔۔پھر کیا ہوا تھا؟'

اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اُس کے بیڈ کے پاس کرسی بچھائے خدیجہ بیٹھی تھی اور سامنے سیٹی پر بوا نیم دراز تھیں۔

اُس نے بازو اوپر اٹھانے کی کوشش کی تو اس کی سسکی نکل گئی۔ بازو میں ڈرپ کی سُوئی لگی ہوئی تھی اور قطرہ قطرہ گلوکوز اُس کی رگوں میں اُتر رہا تھا۔

'پھر کیا ہوا تھا۔۔۔؟'

اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔۔۔اور اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ دوبارہ اُس کی آنکھ اسی ہسپتال میں کھلی تھی اور سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر کو فوری طور پر سیزرین کرنا پڑا تھا۔ وہ تو بچ گئی تھی، لیکن وہ بچہ، جس کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لئے اپنے آخری دن بھی افروز مصروف رہا تھا، وہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی موت کی آغوش میں چلا گیا تھا۔

''بیٹا تھا تمکین۔۔۔!'' بوا اور خدیجہ نے اسے بتایا تھا۔

بالکل افروز کی طرح ہوتا اگر زندہ ہوتا۔ اور وہ اسے دیکھ بھی نہ سکی تھی۔ عقیل نے اپنے موبائل میں اُس کی تصویر لی تھی، لیکن ابھی تک وہ تصویر بھی نہیں دیکھ پائی تھی۔ اُسے لگتا تھا جیسے وہ دیکھے گی تو اُس کا دل پھٹ جائے گا۔۔۔ گرم گرم آنسو اُس کی بند آنکھوں سے نکل کر اس کے رخساروں پر سے ہوتے ہوئے گردن کو بھگوتے جا رہے تھے۔

خدیجہ، جو کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے نیم دراز سی تھی، یکایک سیدھی ہو کر بیٹھی اور بے قراری سے تمکین کے رخسار پر ہاتھ رکھا۔

''تمو! حوصلہ کرو۔''

''کیسے؟۔۔۔کیسے خدیجہ؟'' اُس نے آنکھیں کھول دی تھیں اور زیادہ تیزی سے اس کے آنسو بہنے لگے تھے۔

''میرا جی چاہتا ہے، میں چیخیں مار مار کر روؤں۔ دیواروں سے سر ٹکراؤں۔ میرا جو نقصان ہو گیا ہے، وہ کیسے پورا ہو گا؟۔۔۔کون پورا کرے گا؟ کہاں سے لائے گا کوئی اُسے، جسے میں اپنے خون سے سینچ رہی تھی؟ جسے بڑا ہو کر میرا سہارا بننا تھا؟''

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ نرس نے آکر اسے سکون کا انجکشن لگا دیا۔

پچھلے چھ دن سے اس کی یہی حالت تھی۔ وہ جب بھی ہوش میں آتی، یونہی دھاڑیں مار مار کر روتی۔ اپنا سر پلنگ کی پٹی سے ٹکراتی۔ بوا کے اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑتی کہ اسے مر جانے دیں۔

ہولے ہولے اس کا رونا بند ہوا اور پھر وہ سسکیاں لیتے لیتے سو گئی۔

خدیجہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھے تاسف سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسی روز ہری پور سے ایبٹ آباد کچھ دن رہنے کے لئے آئی تھی اور آتے ہی اسے تمکین کے حادثے کا پتہ چلا تھا۔ ہسپتال سے شاید شہر بانو نے فون کر کے اطلاع دی تھی۔ عقیل بھائی اور اس کے باباجان ہسپتال گئے ہوئے تھے۔ عقیل بھائی تو وہیں ہی رہ گئے تھے، لیکن باباجان گھر آ گئے تھے اور انہوں نے ساری تفصیل بتائی تھی کہ پتہ نہیں کیسے وہ پہاڑی سے نیچے گر گئی۔ وہ تو اتفاق سے ریسٹ ہاؤس میں رہنے والے ایک شخص نے، جو واک کے لئے نکلا تھا، اسے گرتے ہوئے دیکھا اور پھر اپنی جیپ میں شہر بانو وغیرہ کے ساتھ یہاں

لایا۔ وہ باباجان کے ساتھ ہی ہسپتال آ گئی تھی۔ بوا بھی وہیں تھیں اور تب سے وہ اور بوا اس کے ساتھ ہسپتال میں تھیں۔ دن کو وہ گھر چلی جاتی تو عقیل آ جاتا تھا۔ شہر بانو تو اسی روز واپس چلی گئی تھیں۔

"اماں اکیلی ہیں وہاں۔ آپ لوگ تو ہیں نا اس کے پاس۔ اس لئے میں چلتی ہوں۔" وہ چلی گئی تھیں اور وہاں جا کر صرف ایک بار ان کا فون آیا تھا۔

"تمکین بٹی کو کب تک یہاں رہنا ہے۔۔۔؟" بوا نے پوچھا تو خدیجہ چونک کر اُنہیں دیکھنے لگی۔

"نرس بتا رہی تھی کہ کل صبح ڈسچارج کر دیں گے۔"

بوا نے سر ہلا دیا۔

"بیٹا! میں تو کہتی ہوں، تم ہی تمکین کو سمجھاؤ کہ وہ اب واپس آ جائے۔ وہاں پھلکوٹ میں کیا ہے؟ یہاں ایبٹ آباد میں رہے۔ اور تمہارے ابامیاں دیکھ بھال کر کہیں شادی کر دیں۔ تنہا کب تک رہے گی؟ ان لوگوں کا بھی کوئی بھروسہ نہیں، کب نکال باہر کریں۔ اب تو اولاد کا بھی آسرا نہیں رہا۔"

خدیجہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ سب عقیل بھائی، اماں اور باباجان سمیت تمکین کے خیر خواہ تھے۔ لیکن فیصلہ تو بہر حال اسی نے کرنا تھا۔ اور وہ کیا فیصلہ کرے گی، اس کا اسے اندازہ نہ تھا۔ البتہ عقیل بھائی کا خیال تھا کہ وہ پھلکوٹ میں ہی رہنا پسند کرے گی۔ شاید آنے والے کسی وقت میں وہ پھلکوٹ سے چلی آئے، لیکن ابھی نہیں۔ وہ اپنے بچے کے ساتھ وہاں، اسی گھر میں رہنا چاہتی تھی، جہاں افروز کے ساتھ رہتی تھی۔ اور اب تو بچہ بھی نہیں رہا تھا۔

اُس نے خاموش لیٹی تمکین کو دیکھا، جو ہوش میں آتے ہی دیوانوں کی طرح چیخیں مارنے لگتی تھی۔ اُس کا ذہن کسی طور بھی اس بات کو قبول نہیں کر رہا تھا کہ وہ اپنے بچے سے محروم ہو چکی ہے۔

"یااللہ! اسے سکون اور صبر عطا فرما۔" خدیجہ نے دل ہی دل میں دعا کی اور اپنے بچوں سے بات کرنے کے لئے فون نمبر ملانے لگی۔

VVV

"تمکین۔۔۔۔!"

وہ تیز تیز چلتی ہوئی جارہی تھی، جب پیچھے سے کسی نے آواز دی تو اُس نے رک کر پیچھے دیکھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے قریب آکھڑا ہوا۔

"بہت تیز چلتی ہیں آپ۔ پتہ ہے، میں کہاں سے آپ کے پیچھے آرہا تھا۔۔۔۔آپ کہاں تھیں اتنے دنوں سے؟ یقین کریں، میں بہت پریشان تھا۔ میں ایک بار اس ہسپتال بھی گیا تھا، لیکن آپ وہاں سے جاچکی تھیں۔۔۔۔ دلبر نے بتایا کہ آپ ابھی ایبٹ آباد میں ہی ہیں۔ وہاں غالباً آپ کے کوئی عزیز رہتے ہیں۔آپ کیسی ہیں اب؟ مجھے اس حادثے کا بہت افسوس ہے۔ میں جانتا ہوں، چند

لفظ ایک ماں کے دل کے زخم نہیں بھر سکتے۔ لیکن میں آپ سے اپنے دکھ کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔" وہ اس کی بات سنے بغیر مسلسل تیز تیز بولتا جارہا تھا۔

"بہت شکریہ کہ آپ نے میرے لئے سوچا۔اور اس کا بھی شکریہ کہ آپ مجھے ایبٹ آباد تک لائے۔ لیکن کاش آپ مجھے نہ لے جاتے۔ جب وہ نہیں رہا تھا تو میں نے کیا کرنا تھا جی کر۔"

اس نے تڑپ کر تمکین کو دیکھا۔

"بری بات ہے بی بی!۔۔۔۔اللہ کی دی ہوئی زندگی کے متعلق اس طرح نہیں کہنا چاہئے۔"

تمکین نے بس ایک نظر اسے دیکھا اور آگے بڑھنے کے لئے قدم بڑھائے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ ہی چلنے لگا۔

"آپ اس وقت کہاں جارہی ہیں؟"

"میں پرائمری سکول تک جارہی ہوں۔ مجھے پتہ چلا تھا، وہاں صرف دو ٹیچرز ہیں۔ شادی سے پہلے بھی میں پڑھاتی تھی تو میں نے سوچا یہاں پڑھا دیا کروں، کچھ وقت پاس ہو جائے گا۔"

"یہ آپ نے بالکل صحیح سوچا ہے۔"

"لیکن پتہ نہیں، اب وہاں کی انچارج مجھے پڑھانے کی اجازت بھی دیں گی یا نہیں۔ حالانکہ میں تو رضاکارانہ طور پر پڑھانا چاہتی ہوں۔ بغیر کسی تنخواہ کے۔"

"ارے واہ۔۔۔۔کیسے اجازت نہیں دیں گی۔ ضرور دیں گی۔" اس نے کہا تو تمکین نے چلتے چلتے ایک لمحے کو رک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟"

"نہیں۔۔۔۔ جانتا تو نہیں ہوں، لیکن مجھے پتہ ہے وہ شکر کریں گی کہ مفت میں کوئی پڑھانے والا مل گیا۔ ورنہ تو سال دو سال یہاں کوئی ٹیچرز آتے ہی نہیں۔"

تمکین سر ہلا کر پھر چلنے لگی۔ لیکن اب اسے اس کے ساتھ چلنے سے کوفت ہو رہی تھی۔

"اور اپنا گل لالہ ہے نایار، سارے علاقے کے لوگ اُس کی بات مانتے ہیں۔ اگر اس نے نہ رکھا تو مجھے بتایئے گا۔"

تمکین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن اس نے ایک لمحے کے توقف کے بعد پھر بات شروع کر دی تھی اور تمکین کو پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ وہ اتنا زیادہ اور بغیر رکے بولتا ہے۔

"آپ کا حادثہ کیسے ہوا تھا؟ کیسے گر گئی تھیں؟ اُف، میں نہیں بتا سکتا، میں نے روڈ پر سے جب آپ کو لڑھکتے ہوئے دیکھا تو کس طرح دیوانوں کی طرح بھاگا تھا۔ تب مجھے علم نہیں تھا کہ وہ آپ ہیں۔ لیکن جب۔۔۔ کیا پائوں پھسل گیا تھا؟"

"نہیں۔۔۔" بے اختیار تمکین کے لبوں سے نکلا۔

"کیا۔۔۔! تو پھر کیسے گر گئی تھیں؟" اس نے حیرانی سے تمکین کو دیکھا۔

"مجھے کسی نے دھکا دیا تھا۔" پہلی بار تمکین نے کسی کو بتایا تھا۔

"نہیں۔۔۔" اس نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ نے دیکھا تھا، کون تھا وہ؟"

"پتہ نہیں۔" تمکین نے اسے تفصیل بتائی۔ "میں نہیں جانتی، وہ کون تھا۔ میرا تو کوئی دشمن نہیں ہے۔ شاید وہی لوئی والا ہو۔۔۔ شاید کسی غلط فہمی میں۔"

وہ تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اب وہ سکول کے قریب پہنچ گئے تھے۔

"آپ کو محتاط رہنا چاہئے مس! اور پھر تو بہتر ہے کہ آپ گھر پر ہی رہیں۔ ہر روز سکول آئیں گی تو کہیں کوئی نقصان ہی نہ پہنچا دے۔"

"اب اور کیا نقصان ہو گا میرا؟ زیادہ سے زیادہ میری جان یہ کوئی لے لے گا نا۔ تو میرا تو جتنا بڑا نقصان ہو گیا ہے، اس کے بعد سب بے معنی ہے۔" اُس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"یہ زندگی آپ کے پاس اللہ کی امانت ہے اور اس کی حفاظت کرنا آپ کا فرض ہے۔"

ایک تلخ سی مسکراہٹ نے لمحہ بھر کے لئے اس کے لبوں کو چھوا اور پھر معدوم ہو گئی۔ وہ اُس کی بات کا جواب دیئے بغیر سکول کے احاطے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی، جہاں اس کا استقبال خوش دلی سے کیا گیا۔

اس پرائمری سکول میں بچیوں کی تعداد سو کے قریب تھی اور انچارج کے علاوہ صرف دو ٹیچرز تھیں۔ سرکاری سکول تھا۔ ٹیچرز کو اپائنٹ تو کیا جاتا تھا، لیکن یہاں آتا کوئی نہیں تھا۔ انچارج کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ میتھس پڑھا سکتی ہے اور اس نے کہا تھا کہ بے شک وہ ابھی سے پڑھانا شروع کر دے۔ لیکن اس نے کہا، وہ کل سے پڑھانا شروع کرے گی۔ اسے ابھی آپا اور اماں کو بھی بتانا تھا۔

جب سے وہ واپس آئی تھی، آپا کتنی ہی بار اسے جتلا چکی تھیں کہ صرف اس کی بے پروائی کی وجہ سے شاہ عالم کی نسل ختم ہو گئی تھی۔ اماں بھی ٹھنڈی آہیں بھرتی تھیں۔ عقیل بھائی، بوا، ماموں جان، سب نے ہی تو اسے منع کیا تھا کہ وہ وہاں نہ جائے۔ لیکن اس کی ضد تھی کہ وہ وہیں رہے گی، اسی گھر میں جہاں افروز کے ساتھ اس نے اپنی زندگی کے خوشگوار اور اُداس دن گزارے تھے۔

"پتہ نہیں کیوں، مجھے لگتا ہے کہ تمہارا وہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ خوف آتا ہے، جیسے تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ اپنے آخری دو دنوں میں افروز تمہاری اور بچے کی حفاظت کے لئے بہت پریشان تھا۔ وہ تمہارے لئے یہاں ایبٹ آباد میں ہی گھر لینا چاہتا تھا لیکن موت نے اسے مہلت نہ دی۔ گو ابھی اس نے مجھ سے کھل کر بات نہیں کی تھی، لیکن اس کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا مجھے کہ وہ

بہت متفکر ہے اور اسے ڈر ہے کہ کہیں کوئی اس کی عدم موجودگی میں تمہیں نقصان نہ پہنچا دے۔"

"ہاں۔۔۔انہوں نے مجھ سے کہا تھا ایک بار کہ میں نادر بھائی سے محتاط رہوں تو میں محتاط ہوں۔ یوں بھی وہ بہت کم پھلکوٹ آتے ہیں۔"

اس نے عقیل بھائی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ ذرا بھی مطمئن نہ ہوئے تھے۔ گو اس سے بحث نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس وقت وہ جس دکھ سے دوچار ہے، اس میں اسے کچھ کہنا اس کے لئے باعثِ اذیت ہی ہوگا۔ بڑی مشکل سے تو وہ سنبھلی تھی۔

"بوا کو ساتھ لے جائو۔"

"اور یہاں، ہمارے گھر کا کون خیال رکھے گا؟"

"کرائے پر چڑھا دیتے ہیں۔"

"اماں اور آپا اعتراض نہ کریں۔"

"وہ تمہارا گھر ہے تمو!۔۔۔پھر بوا کا اس دنیا میں کون ہے؟ یہاں اکیلے بہت گھبراتی ہیں۔" عقیل بھائی نے سمجھایا۔

"ہاں، لیکن میں پہلے آپا سے بات کر لوں۔"

اس نے بات ختم کر دی تھی لیکن یہاں آکر ابھی تک وہ شہر بانو سے بات نہیں کر سکی تھی۔

وہ بے دھیانی میں سر جھکائے احاطے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی تھی اور اب سر جھکائے گھر کی طرف چل پڑی تھی جب وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب آگیا۔

"کیا ہوا، انچارج نے رکھ لیا تھا نا؟"

"آپ یہاں کہاں سے آگئے؟" اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"میں وہاں پتھر پر بیٹھا آپ کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا کہ آپ آجائیں تو آپ کو گھر تک پہنچا دوں۔ کہیں وہ۔۔۔"

"کیوں۔۔۔کیا آپ خدائی فوجدار ہیں؟ اور پھر مجھے تو ہر روز آنا ہے یہاں۔ اور کیا آپ ہر روز مجھے چھوڑنے اور لینے آتے رہیں گے؟"

"آپ اجازت دیں تو ہر روز بھی یہ کام کر سکتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔ "آپ نے جو بتایا ہے، اس کے بعد تو میرا فرض بنتا ہے کہ میں آپ کو بحفاظت اسکول پہنچا دیا کروں۔"

"کس رشتے سے آپ کا فرض بنتا ہے مسٹر؟"

"دانیال۔۔۔۔دانیال مرزا۔" اُس نے ذرا سا سر خم کیا۔ "اور جہاں تک رشتے کی بات ہے تو ہر انسان کا دوسرے انسان سے کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور ہوتا ہے۔"

"آپ بولتے بہت ہیں۔" تمکین کے انداز میں ناگواری صاف محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن وہ بھی کسی ڈھیٹ مٹی سے بنا ہوا تھا۔

"میرے بابا بھی کہتے تھے، یار! اپنی گفتگو میں کوئی کوما، بریک، فُل اسٹاپ بھی لگا لیا کر۔ لیکن میں۔۔۔۔خیر آپ پریشان نہ ہوں۔ آج سے میں کم بولنے کی پریکٹس شروع کر دوں گا۔"

"آپ کم بولیں یا زیادہ، مجھے بھلا کیا؟" تمکین چڑ سی گئی۔

"بجا فرمایا آپ نے۔ آپ کو کیا۔۔۔۔ لیکن میری عادت ہے، میں مستقبل کی پلاننگ بھی کر لیا کرتا ہوں۔"

تمکین نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔ اس کی توجہ کچھ فاصلے پر جانے والی پہاڑی لڑکی کی طرف بڑھ گئی تھی، جو گود میں چند ماہ کا بچہ اٹھائے ہوئے تھی۔ ایک دم ہی احساسِ زیاں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اندر ہی اندر ایک گہرا دُکھ اُس کے وجود کو کاٹنے لگا تھا۔ وہ اس وقت تک اس لڑکی کو دیکھتی رہی، جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ دانیال نے بھی اس کی توجہ کا مرکز دیکھ لیا تھا اس لئے وہ خاموش ہو گیا تھا۔

جوں ہی بازار شروع ہوا، وہ اس سے کافی فاصلے پر چلنے لگا۔ تمکین نے اُس کی اس احتیاط پسندی کو محسوس کر کے دل ہی دل میں سراہا۔

گھر سے کچھ فاصلے پر وہ رک گیا۔

"اپنا خیال رکھئے گا، تمکین! بعض فیصلے قدرت کی طرف سے ہوتے ہیں اور انہیں قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔ یقین جانئے، آپ کے احساسِ زیاں کے خیال نے مجھے ہفتوں سونے نہیں دیا۔ بہت بڑا نقصان ہوا ہے آپ کا۔۔۔۔ لیکن انسان مجبور ہے۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ تیزی سے ریسٹ ہاؤس والی سڑک کی طرف مڑ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تمکین نے اس کی پشت کی طرف دیکھا اور پھر اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

VVV

تمکین جونہی روڈ کراس کر کے سکول والی روڈ کی طرف مڑی، وہ کسی موڑ سے نکل کر ایک دم اس کے سامنے آ گیا۔

"السلام علیکم ! کیسی ہیں آپ ؟"

"وعلیکم السلام۔" تمکین نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور اپنے بڑے سے دوپٹے کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا۔

"اسکول کیسا جا رہا ہے ؟" وہ اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ یوں بھی اسکول ذرا آبادی سے ہٹ کر تھا۔

"ٹھیک۔" تمکین نے مختصراً کہا۔

"آپ ہمیشہ اتنا ہی مختصر بولتی ہیں یا پھر میرے ساتھ۔۔۔؟"

اب کے تمکین خاموش رہی تھی۔

"کیا بات ہے، ناراض ہیں ؟۔۔۔اوہ۔" وہ ہولے سے ہنسا۔ "آپ سمجھ رہی ہوں گی کہ اس روز بڑے بڑے دعوے کرنے کے بعد پھر سامنے آیا ہی نہیں۔ تو مس ! میں ہر روز آپ کی نظر میں آئے بغیر آپ کے پیچھے پیچھے ہی ہوتا ہوں۔ ان پہاڑی راستوں میں آدمی خود کو بڑی اچھی طرح کیموفلاج کر لیتا ہے۔"

تمکین کے قدم ایک لمحے کے لئے رک گئے تھے اور اس نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔

"سچی بات ہے، مجھے آپ سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں سامنے آیا تو آپ کان پکڑ کر واپس بھیج دیں گی کہ مجھے خدائی فوجدار بننے کی ضرورت نہیں۔" ہمیشہ کی طرح وہ تیز تیز بول رہا تھا۔

"لیکن آج صبر نہیں کر پایا۔ آپ کو دیکھا تو۔۔۔" اُس نے بے حد گہری اور اشتیاق بھری نظر اُس پر ڈالی اور اُس کے اس طرح دیکھنے پر تمکین پزل سی ہوئی۔ لیکن اپنی کیفیت چھپانے کے لئے طنزیہ انداز میں بولی۔

"آپ کی تحقیق کیا اب تک مکمل نہیں ہوئی ؟ سارا دن اگر آپ دوسروں کو بحفاظت گھر سے لانے اور پہنچانے کا کام کرتے ہیں تو پھر تحقیق کب کرتے ہیں ؟"

"تحقیق تو خیر بہت پہلے مکمل ہو گئی تھی۔" مدھم سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر نمودار ہوئی۔ "میرے ساتھ دو فرنچ ماہر بھی آئے ہوئے تھے جو بالاکوٹ میں تھے۔ سو ہماری تحقیق پر مشتمل پیپرز وہ لے کر واپس چلے گئے ہیں لیکن میں نہیں گیا۔ بقول آپ کے دوسروں کو بحفاظت پہنچانے کے لئے۔۔۔"

بات ادھوری چھوڑ کر اس نے تمکین کے چہرے پر ایک شرارت بھری نظر ڈالی۔ تمکین سٹپٹا کر تیز تیز چلنے لگی۔

"دوسروں کے بجائے آپ یہ بھی کہہ سکتی تھیں کہ آپ کی۔" وہ اُس کے برابر ہی چل رہا تھا۔

"میرے خیال میں آپ کو میں نے اپنی حفاظت کے لئے مامور نہیں کیا۔" اس نے رفتار تیز کر دی۔

"جی بالکل۔۔۔ لیکن کچھ ذمے داریاں از خود بھی عائد ہو جاتی ہیں۔"

سیاہ، شیشوں والی چادر کے ہالے میں چھپا اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہوا۔

"آپ کو اور کوئی کام نہیں ہے؟ اور کوئی پوچھنے والا نہیں بیوی بچے، ماں باپ، جو اتنے عرصے سے یہاں اجنبی جگہ پر پڑے ہیں؟"

"عشق نے غالب نکما کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

"کیا مطلب۔۔۔؟" تمکین کو حیرت ہوئی۔

"کچھ نہیں۔" اس نے کان کھجائے۔ "فی الحال تو کوئی کام نہیں سوائے۔۔۔ اور جہاں تک بیوی بچوں کی بات ہے تو ابھی شادی نہیں کی۔ ماں باپ اس دنیا میں نہیں رہے۔ بھائی کوئی ہے نہیں۔ ایک بڑی بہن ہے جو کینیڈا میں ہے۔ سو نہ فکر نہ فاقہ۔ مزے سے اس بستی کے حُسن کو انجوائے کر رہا ہوں۔ اگر آپ کو اعتراض ہے تو چلا جاتا ہوں۔"

"مجھے بھلا کیوں اعتراض ہو گا؟ کیا پھلکوٹ میری جائیداد ہے؟" تمکین نے جھلّا کر کہا اور رفتار پہلے سے بھی زیادہ تیز کر دی۔

وہ وہیں ایک طرف درخت سے ٹیک لگا کر اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سکول کے احاطے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ درخت سے ٹیک لگائے کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے ہاتھ ہلایا۔

"عجیب آدمی ہے۔"

وہ زیر لب بڑبڑائی اور برآمدے کی طرف بڑھ گئی، جہاں کچھ بچیاں چٹائی پر بیٹھی تھیں۔ اس سکول میں صرف تین چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ اس لئے دو جماعتیں برآمدے میں لگا کرتی تھیں۔ وہ بچیوں کے سلام کا جواب دیتے ہوئے ہیڈ مسٹریس کے آفس کی طرف بڑھ گئی۔ سکول کی انچارج، ہیڈ مسٹریس اس سے بہت خوش تھی۔ مہر بانو اور شہر بانو نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ البتہ شہر بانو نے اس کی تنخواہ ضرور پوچھی تھی۔

"کچھ نہیں۔۔۔ رضاکارانہ طور پر پڑھا رہی ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔" مہر بانو نے تائید کی تھی۔ "تمہارا دل بھی بہل جائے گا اور بچیوں کا بھلا بھی ہو جائے گا۔"

"افروز اتنا کچھ چھوڑ کر مرا ہے۔ اسے تنخواہ کی ضرورت بھی کیا ہے؟ اور جہاں تک دل بہلانے کی بات ہے تو بی بی! اس طرح دل نہیں بہلتا۔ شادی کر لو۔ خود ہی دل بہل جائے گا۔" شہر بانو نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز اور مسکراہٹ کے ساتھ بات کی تھی۔

"ویسے تمکین! تمہارا اور افروز کا مشترکہ اکاؤنٹ ہے۔ کافی پیسہ ہو گا اس میں۔ سنا ہے بوسٹن والا مکان کئی لاکھ ڈالرز کا تھا۔ بلکہ نادر کہہ رہا تھا کہ کئی کروڑ۔۔۔"

"پتہ نہیں۔" تمکین ہمیشہ کی طرح افروز کے ذکر سے اداس ہو گئی تھی۔ تہ در تہ اُداسی اس کے دل پر برف کی طرح گرنے لگی تھی۔ اس نے آپا کی باتوں پر غور نہیں کیا تھا۔ اس کے تصور میں تو افروز کی آخری دنوں کی باتیں آ رہی تھیں۔ کتنا پریشان تھا وہ۔ اور پتہ نہیں کیا کیا کرتا پھر رہا تھا۔

"اگر اس کے اکائونٹ میں پیسہ ہے تو تمہیں کیا غرض ہے؟ اس کی بیوی ہے۔" مہر بانو کہہ رہی تھیں۔

"تو میں کیا اس کا پیسہ چھین رہی ہوں اماں؟ آپ بھی بس۔۔۔۔ دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا۔" مہر بانو بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"دماغ میرا نہیں، تیرا خراب ہو گیا ہے شہر بانو!"

تمکین انہیں سن تو رہی تھی، لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ آپا نے اس کے سکول جانے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔"

وہ کچھ دیر ہیڈ مسٹریس کے کمرے میں بیٹھ کر اپنی جماعت میں آ گئی تھی۔ دوسری ٹیچرز بھی آ گئی تھیں۔ بچیوں کو حساب سمجھاتے ہوئے بھی اس کا ذہن کئی بار دانیال مرزا کی طرف گیا تھا اور اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"عجیب آدمی ہے۔"

چھٹی کے وقت غیر ارادی طور پر اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن وہ اسے نظر نہیں آیا تھا۔ اس وقت بچیاں بھی تھیں، جن کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے وہ گاہے گاہے اِدھر اُدھر بھی دیکھ لیتی۔ جب وہ اپنے گھر کے روڈ کی طرف مڑی تو وہ اچانک اس کے سامنے چلا آیا۔

"آپ کو یقین نہیں آیا تھا کہ میں آپ کے ساتھ ہوتا ہوں۔"

بات کر کے وہ رکا نہیں تھا، مسکراتا ہوا ریسٹ ہائوس کی سڑک کی طرف مڑ گیا تھا۔ تمکین کو بڑی تقویت کا احساس ہوا تھا۔ کبھی کبھی جو وہ یک دم چلتے چلتے خوفزدہ ہو جاتی تھی، اسے لگتا تھا، جیسے اب اسے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

گھر کے باہر جیپ کھڑی دیکھ کر اس نے سمجھ لیا تھا کہ نادر خان آیا ہوا ہے۔ کتنی دیدہ دلیری سے تمکین سے پوچھے بغیر وہ جیپ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہ جیپ افروز کی تھی۔ وہ اسے ڈرائیو کرتا تھا۔ اس کے اسٹیئرنگ پر اس کا لمس موجود تھا۔ پتہ نہیں کیوں، آج وہ جیپ کو دیکھ کر جذباتی ہو گئی۔

'میں نادر بھائی سے کہوں گی کہ وہ جیپ اب نہ لے کر جائیں۔ یہ افروز کی جیپ تھی اور یہ اُس کے بچے کے لئے۔۔۔۔"

یک دم اُسے خالی پن کا احساس ہوا۔

'اُس کا بچہ۔۔۔۔ پتہ نہیں کون تھا وہ، جس نے دھکا دیا تھا۔ اگر وہ مجھے مل جائے تو میں اپنے بچے کا قتل اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں۔۔۔۔'

آپا کو جب چند دن پہلے اس نے بتایا تھا کہ اسے کسی نے دھکا دیا تھا تو آپا بے حد ہنسی تھیں۔

"لو بھلا، وہاں کوئی جن یا چڑیل آ گئی تھی، جس نے تمہیں دھکا دیا؟ اور پھر کسی کو کیا ضرورت تھی؟"

لیکن اسے اس میں ایک فیصد بھی شبہ نہ تھا۔

'کاش۔۔۔اے کاش، میں کبھی جان سکوں تو۔۔۔' وہ اپنے خیالوں میں گم گھر میں داخل ہوئی تو پہلی نظر اس کی نادر خان پر ہی پڑی تھی، جو غالباً مہر بانو سے مل کر باہر آرہا تھا۔ نادر خان کی نظروں نے اس کے پورے وجود کا جیسے ایکسرے کیا تھا۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''سنا ہے، تم کہیں پڑھانے شڑھانے لگ گئی ہو۔''

تمکین صرف اثبات میں سر ہلا کر لائونج کی طرف بڑھ گئی تھی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے ہی تھا۔

''تم مجھ سے اتنا گھبراتی کیوں ہو؟ ہر بات کے جواب میں من بھر کا سر ہلا دیتی ہو۔ کیا زبان نہیں ہے تمہارے منہ میں؟''

عجیب گنواروں جیسا انداز تھا۔ تمکین کو بہت کوفت ہوئی۔ وہ شہر بانو کا شوہر تھا، اس لئے اسے مجبوراً بولنا پڑا۔

''مجھے زیادہ بولنے کی عادت نہیں ہے۔''

''تو کم کم ہی بولا کرو نا، سرکار!''

تبھی شہر بانو اپنے کمرے سے نکل آئیں۔ ایک تیز نظر نادر خان پر ڈال کر وہ تمکین کی طرف دیکھنے لگیں۔ غالباً شہر بانو نے نادر خان کا جملہ سن لیا تھا۔

''تم آگئی ہو؟''

''جی آپا!'' اس نے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے۔

''نادر خان کو کچھ ضروری کاغذات چاہئے تھے، لاکر کی چابی تمہارے پاس ہے؟''

''نہیں تو آپا! شاید کسی دراز میں ہو۔''

''نادر خان بہت ہوشیار آدمی ہے تمو! اس نے باباجان کی بہت سی پراپرٹی دھوکے سے اپنے نام کرلی ہے۔ اگر زندگی نے مجھے مہلت دی تو میں کوشش کروں گا کہ اس سے حساب کتاب ہو جائے۔''

لیکن زندگی نے اسے مہلت ہی کب دی تھی۔

''کیسے کاغذات۔۔۔؟'' وہ سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے رک گئی تھی۔

''وہ بزنس کے متعلق ہیں۔۔۔اوپر تمہارے کمرے کے لاکر میں تھے۔'' شہر بانو نے بتایا اور اس کے ساتھ ہی سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کے پیچھے بنے لاکر میں افروز نے ضروری کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ دو ایک بار اس نے افروز کو لاکر کھولتے اور فائلیں وغیرہ رکھتے دیکھا تھا۔ لیکن افروز کے بعد وہ اپنے دکھ میں ایسی ڈوبی ہوئی تھی کہ ایک بار بھی اسے کھول کر دیکھنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں، اس لاکر میں کیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں خیال آیا تھا کہ کاش آپا اس کے ساتھ اوپر نہ آئیں اور وہ اکیلے میں افروز کے کاغذات کو دیکھے۔ لیکن آپا ہی نہیں، نادر خان بھی ان کے پیچھے آرہا تھا۔ بیڈ پر جھک کر وہ اپنے جوتے اتارنے لگی جبکہ شہر بانو بیڈ کی سائیڈ دراز کھول کھول کر دیکھ رہی تھیں۔ نادر خان پہلی بار اس کے بیڈ روم میں آیا تھا اور چاروں طرف تنقیدی نظروں سے دیکھنے کے بعد ٹیرس کا دروازہ کھول کر ٹیرس پر نکل گیا تھا۔

شہر بانو نے چابیوں کے دورِ نگ نکال لئے تھے اور اب ڈریسنگ کا شیشہ ہٹا کر باری باری چابیاں لاکر میں گھما رہی تھیں۔ تمکین خاموشی سے انہیں دیکھ رہی تھی اور حیران تھی کہ جب وہ گھر پر نہیں ہوتی تھی اور جب وہ ایبٹ آباد میں افروز کی موت کے بعد رہی تھی تو کیا آپا نے افروز کا لاکر کھول کر نہیں دیکھا تھا؟

نادر خان بھی ٹیرس کا جائزہ لے کر اندر آگیا تھا۔تب تک شہر بانو نے لاکر کی ایک دراز کھول لی تھی، جو خالی تھی۔شہر بانو نے مڑ کر نادر خان کی طرف دیکھا اور پھر دوسری دراز کھول لی۔اس میں صرف ایک چھوٹا سا سنہری کنگ کا جیولری باکس تھا جس پر رنگ برنگے پتھر جڑے تھے۔یہ انہوں نے ناران میں ایک شاپ سے لیا تھا اور اس میں تمکین نے اپنے عام استعمال کے چھوٹے موٹے زیور رکھے ہوئے تھے اور افروز کے بعد اس نے ایک بار بھی اسے کھول کر نہیں دیکھا تھا۔شہر بانو کے ہاتھ میں جیولری باکس تھا اور اس کے اندر یادوں کے کئی در کھل گئے تھے۔

وہ چڑھائی چڑھ کر اس شاپ تک آئے تھے۔

”تم نے کوئی شاپنگ بھی نہیں کی۔کچھ تو لے لو۔“ افروز نے کہا تھا۔

”مجھے کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں۔“

”یار! بلا ضرورت ہی لے لو، یادگار کے طور پر۔۔۔۔یہ بے چارے دکان دار سارا سال سیاحوں کا انتظار کرتے ہیں۔“

تب اس نے نگوں والا یہ جیولری باکس اور اخروٹ کی لکڑی کا ڈرائی فروٹ سیٹ لیا تھا۔

شہر بانو اب دراز بند کر کے معنی خیز نظروں سے نادر خان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”یہاں تو کچھ نہیں۔“

”کیا افروز نے کہیں اور کسی جگہ بھی اپنے کاغذات وغیرہ رکھے ہوئے ہیں؟“ نادر خان پوچھ رہا تھا۔

”معلوم نہیں۔“ اس نے بے حد بیزاری سے کہا۔”ویسے آپ کے بزنس کے کاغذات کا ان سے کیا تعلق؟“

”ہوں۔۔۔۔ہاں۔“ شہر بانو نے ہنکارا بھرا۔

”کیا افروز کا بھی کوئی شیئر تھا آپ کے بزنس میں؟“ تمکین کے لبوں سے غیر ارادی طور پر نکلا تھا اور وہ نادر خان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”نہیں۔“ اس کے بجائے شہر بانو نے جواب دیا۔”اس کا ہمارے بزنس سے کیا تعلق؟ وہ تو آٹھ سال بعد آیا تھا امریکہ سے۔“

نادر خان ایک بار پھر تنقیدی نظروں سے بیڈ روم میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی نظر وارڈروب کے ساتھ والی دراز پر پڑی تو دو قدم آگے بڑھ کر اس نے اسے بھی کھول کر دیکھا۔

’کیا یہ کوئی ڈرامہ ہے؟‘ تمکین نے سوچا۔ان کی اس ساری سرگرمی کی وجہ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''شاید اماں کے کمرے میں ہوں۔'' شہر بانو نے بغیر کسی کو مخاطب کئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔
نادر خان نے جاتے جاتے اس پر ایک گہری نظر ڈالی تھی۔ بڑی غلیظ نظریں تھیں اُس کی۔ تمکین سمٹ کر رہ
گئی۔

جس صبح ایبٹ آباد جانا تھا، افروز نے لاکر سے کئی فائلیں اور پیپرز نکال کر اپنے بریف کیس میں رکھے تھے اور
اسے یاد آیا تھا کہ افروز نے اسے بتایا تھا کہ اس نے بینک کے لاکر میں سب قیمتی دستاویزز رکھوا دی ہیں اور یہ لاکر
بھی اس نے بیماری کے بعد ہی لیا تھا اور مشترکہ تھا۔ لاکر کی چابی اور دوسرے کاغذات ایبٹ آباد میں ہی تھے۔
اب جب کبھی وہ ایبٹ آباد گئی تو اپنے زیورات بھی لاکر میں رکھ دے

گی۔ اس نے سوچا اور بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھا جیولری باکس اٹھا لیا، جسے آپا وہیں چھوڑ گئی تھیں۔ جیولری باکس
کو ہاتھ میں لیتے ہی ایک بار پھر وہ ناراں پہنچ گئی تھی۔

''اگر یہاں اس پر ایک ہی رنگ کے پتھر جڑے ہوئے تو زیادہ خوب صورت نہ ہوتے۔'' افروز نے کہا تھا۔

''ہاں، لیکن ان رنگ برنگے پتھروں میں بھی ایک حُسن ہے۔ اس علاقے کا کلچر ہے یہاں۔''

یک دم اُس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اس نے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لئے اور گرم گرم آنسوؤں سے اُس کے ہاتھ
بھیگتے چلے گئے۔

VVV

مہر بانو کو چائے کا کپ پکڑا کر تمکین ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ شہر بانو نے، جو صوفے پر دونوں پاؤں رکھے بیٹھی
ٹی وی دیکھ رہی تھیں، ٹی وی آف کر کے اس کی طرف دیکھا۔

''تم نے اب کیا سوچا ہے تمکین؟ کیا ساری عمر استانی بنی رہو گی؟''

تمکین سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔

''جوان ہو، خوش شکل ہو۔ ماں باپ، بہن بھائی کوئی تمہارا ہے نہیں، جو تمہارے لئے سوچے۔ افروز کے ناتے
سے ہمیں ہی اب کچھ سوچنا ہے۔ کیوں اماں؟'' وہ تمکین سے نظریں ہٹا کر مہر بانوں کو دیکھنے لگیں۔ ''میں تو
کہتی ہوں کہ کوئی اچھا بندہ دیکھ کر اس کی شادی کر دیں۔''

تمکین نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

''نہیں آپا! مجھے شادی نہیں کرنی۔''

''کیوں؟۔۔۔۔ ساری عمر یوں تو نہیں گزر سکتی۔ پھر بچہ ہوتا تو تب بھی اس کے سہارے عمر گزار لیتیں۔ اب
تو وہ بھی تمہاری بے پروائی کی وجہ سے۔۔۔۔''

"میری بے پروائی سے نہیں آپا! مجھے کسی نے دھکا دیا تھا۔" پہلی بار ان کے سامنے تمکین نے کہا تو شہر بانو ہنسنے لگیں۔

"لو بھلا، تمہارا کون دشمن ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔۔۔ لیکن مجھے کسی نے دھکا دیا تھا۔"

"دماغ چل گیا ہے اس کا اماں!" شہر بانو نے مہر بانو کو مخاطب کیا۔

"اماں! آپ میرا یقین کریں، میں سچ کہہ رہی ہوں۔" تمکین روہانسی ہو گئی۔ "میں فاتحہ پڑھ کر اُٹھی تھی اور۔۔۔"

وہ تفصیل بتانے لگی تو شہر بانو کندھے اچکا کر دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ مہر بانو کسی گہری سوچ میں گھونٹ گھونٹ چائے پی رہی تھیں۔ ریموٹ سے دو تین چینلز بدلنے کے بعد شہر بانو نے پھر تمکین کو مخاطب کیا۔

"دیکھو تمکین! ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ تمہارے بھائی صاحب رات کہہ رہے تھے کہ یہاں والا گھر فروخت کر کے ہم لوگ مستقل اسلام آباد شفٹ ہو جائیں گے تو تم اکیلی کہاں دھکے کھاؤ گی؟ بہتر ہے کہ جانے سے پہلے تمہارا کوئی بندوبست ہو جائے۔"

"یہ گھر۔۔۔ مگر یہ گھر تو افروز کا ہے اور انہوں نے۔۔۔"

"تو۔۔۔ تمہارا کتنا حق ہے افروز کے گھر پر؟۔۔۔ اولاد تو تمہاری ہے نہیں۔ جو حصہ تمہارا بنے گا، وہ تم لے لینا۔ نادر تو کئی لوگوں سے بات چیت کر رہے ہیں یہاں اچھی قیمت مل جائے گی۔ اس علاقے کا سب سے خوب صورت گھر ہے یہ۔"

شہر بانو نے بے پروائی سے کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا، جو زرد ہوتے چہرے کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔ نادر بھائی اس گھر کو فروخت نہیں کر سکتے۔ میں اسے فروخت نہیں کرنے دوں گی۔" شہر بانو طنزیہ انداز میں ہنس دیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں تم کمزور، لاچار عورت کیا کر سکتی ہو۔

"یہ گھر افروز نے میرے نام کر دیا تھا۔" اس نے آدھا کپ چائے پی کر کپ وہیں چھوٹی ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور کھڑی ہو گئی تھی۔

"میں یہیں رہوں گی۔۔۔ بوا کو بلوا لوں گی۔ آپ نے جانا ہے تو چلی جائیں۔"

"ارے بی بی! کس خیال میں ہو؟ نادر نے تو سودا بھی کر لیا ہے مکان کا۔" وہ پھر ہنسی تھیں۔

"اور یہ مکان تمہارے نام ہے، ایسے دھوکے میں نہیں آنے والے ہم۔ اُس بے چارے کو بھلا بیماری نے مہلت ہی کہاں دی؟ سہرا باندھتے ہی تمہاری نحوست پڑ گئی اس پر۔"

تمکین بنا کچھ کہے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

'بوا صحیح کہتی تھیں۔ یہ لوگ تمہارے ہمدرد نہیں ہیں اور آپا نے کیسے آنکھیں ماتھے پر رکھ لی ہیں۔ میں یہ گھر فروخت نہیں ہونے دوں گی۔'

وہ آنسو پونچھتے ہوئے تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

''تمکین کو کس نے دھکا دیا تھا شہر بانو؟'' اس کے جاتے ہی مہر بانو نے پوچھا۔

''لو، مجھے کیا پتہ؟'' شہر بانو نے نظریں چرالیں۔

''میری طرف دیکھ کر بات کرو شہر بانو!'' مہر بانو اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھ رہی تھیں۔

''اوہو اماں! میں کوئی ولی اللہ ہوں؟ اور پھر اس کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ افروز اور بچے کی موت نے نیم پاگل کر دیا ہے۔''

''وہ پاگل نہیں ہے شہر بانو!۔۔۔ نادر نے دھکا دیا ہے اسے۔''

''لو، اسے بھلا کیا ضرورت تھی دھکا دینے کی؟'' شہر بانو نے کسی قدر بلند آواز میں کہا اور پھر فوراً ہی آواز آہستہ کر لی۔

''اور آپ خوامخواہ غلط سلط اندازے نہ لگائیں۔''

''میں غلط سلط اندازے نہیں لگا رہی، شہر بانو! کیا کرنا ہے اتنی دولت اکٹھی کر کے؟ اولاد تمہاری ہے نہیں اور تمہاری ہوس کا پیٹ بھرتا ہی نہیں ہے۔ یہ دولت تمہیں لے ڈوبے گی ایک روز۔ اتنی دولت نے نادر کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔ کل کلاں کو اولاد کا بہانہ بنا کر شادی کر بیٹھا تو کیا کرے گی؟ شہر بانو! عقل سے کام لے۔ کیوں ناحق کسی کو ستاتی ہے؟ اور یہ افروز کے بچے کو مار کر تم نے بڑا ظلم کمایا ہے۔ میرے دادا کی نسل ختم کر دی تم نے۔''

''ایسے ہی نہ بولا کریں اماں! میں نے کب مارا ہے، افروز کے بچے کو؟ وہ تو اتفاقی حادثہ تھا۔ اپنی بے پروائی سے پاؤں پھسلا۔''

سب جانتی ہوں میں۔ مجھے نہ بتا۔ اور جتنا حاصل کر لیا ہے، اسی پر قناعت کر لے۔ مزید کا لالچ نہ کر اور۔۔۔ ہائے شہر بانو! کیسا پتھر سا کلیجہ ہے تیرا؟ کیسے تُو نے سوچا اس معصوم بچے کو مارنے کا۔۔۔''

''بس اماں!'' شہر بانو نے دایاں ہاتھ ذرا سا اوپر اٹھایا۔ ''اب مزید اس بات کو مت دہرانا۔ میں نے کہہ دیا نا کہ ہم نے کسی بچے کو نہیں مارا تو نہیں مارا۔''

مہر بانو نے بہت دکھ اور بے بسی سے اسے دیکھا۔

''اور۔۔۔'' شہر بانو تمسخر سے ہنسی۔ ''اپنا کارنامہ بھول گئی ہو کیا، جو آپ نے افروز کے ابا کے۔۔۔''

''میں نے۔۔۔'' مہر بانو کھڑی ہو گئیں۔ وہ غصے کی شدت سے ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔

"وہ تم تھیں اور نادر خان۔۔۔ تم نے ہی اُکسایا تھا مجھے۔۔۔اور پھر۔۔۔"

"چھوڑو اماں! آپ ایسی کاکی یا دودھ پیتی بچی نہیں تھیں کہ ہمارے کہنے پر کسی کو قتل کرنے کا سامان کرتیں۔"

"تمہارے ہی کہنے پر اور سمجھانے پر مجھ سے غلطی ہوئی۔ تم نے ہی کہا تھا کہ شاہ عالم نے مجھے ٹھکرایا تھا، افروز کی ماں کی خاطر۔"

"اچھا بس کریں اپنی تقریر اور سنیں، آپ کی زبان سے اب اس کے متعلق ایک لفظ بھی نہ نکلے۔ ورنہ اس عمر میں ہمارے ساتھ آپ بھی خوار ہوں گی۔"

"پچھتاؤ گی شہر بانو! پچھتاؤ گی۔ کسی کا حق مار کے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔" انہوں نے جاتے جاتے کہا اور لاؤنج سے باہر نکل گئیں۔ اور شہر بانو کے لبوں پر تمسخرانہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔" انہوں نے سر کو ہلکا سا دائیں سے بائیں جھٹکا اور پھر ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

VVV

"کیا بات ہے۔۔۔آپ کچھ پریشان ہیں؟"

ہمیشہ کی طرح وہ اچانک ہی ایک موڑ سے نکل کر اس کے قریب چلنے لگا تھا۔

تمکین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"آپ یہاں ہی ہیں ابھی تک؟ میں نے تو سمجھا تھا کہ آپ چلے گئے ہیں۔"

"ہاں، گیا تھا صرف چند دن کے لئے کراچی۔ کچھ بینک کا کام تھا اور کچھ دوسرے کام۔ سو کام کر کے واپس آ گیا۔"

"اور آپ کی جاب؟" چلتے چلتے ذرا سا رخ موڑ کر تمکین نے اس کی طرف دیکھا اور اپنی سیاہ چادر کو دائیں ہاتھ سے درست کیا۔ دانیال مرزا کی نگاہیں کچھ دیر اس کے چہرے پر ٹھہر سی گئیں لیکن پھر فوراً ہی اس نے نظریں جھکا لیں۔

"جاب سے فی الحال چھٹی۔" وہ مسکرایا۔

"کیا آپ ہمیشہ یہاں رہنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" تمکین نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔ ہمیشہ تو نہیں۔ لیکن فی الحال کچھ عرصے تک۔" وہ چلتے چلتے رک گیا۔ "میں نے کچھ پوچھا تھا آپ سے۔"

"کیا۔۔۔؟" تمکین نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

‘‘آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔ کہیں پھر کسی نے تو۔۔۔’’

‘‘نہیں، بس یونہی۔’’

‘‘مس! کیاآپ مجھ پر اعتبار کر سکتی ہیں؟اور کیا کچھ دیر کو مجھے اپنا خیر خواہ سمجھ کر اپنی پریشانی شیئر کر سکتی ہیں۔’’

تمکین کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ یہ شخص اس کا کوئی نہیں تھا، لیکن اس کی پریشانی کو محسوس کر رہا تھا۔

کاش! آپی ہی ہوتیں تو۔۔۔افروز کو تو چلے جانا تھا۔ لیکن آپی۔۔۔ عقیل بھائی اور انکل خدیجہ سب ہیں، لیکن میں ان سے کیا کہوں؟ کیا سوچیں گے وہ کہ میں آپا اور اماں کے متعلق اتنی غلط سوچ رکھتی ہوں۔ لیکن آپا کا روّیہ کس قدر تکلیف دہ ہو چکا ہے ان دنوں۔۔۔جب سے نادر بھائی نے انہیں بتایا ہے کہ یہ گھر واقعی میرے نام ہو چکا ہے اور افروز نے جانے سے پہلے اپنی تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کا وارث مجھے اور اپنے بچے کو بنایا ہے اور جب تک بچہ بڑا نہیں ہو جاتا، میں اس کی گارڈین کے طور پر سب پراپرٹی اور رقم کی مالک ہوں گی اور نادر خان کو یہ سب معلومات افروز کے وکیل سے ہوئی ہیں۔ آپا تو تب سے اٹھتے بیٹھتے طنز کرنے لگی ہیں۔ ابھی صبح سکول آنے سے پہلے بھی کس قدر بول رہی تھیں۔

‘‘بی بی! ہمیں کب اس گھر سے دیس نکالا دو گی؟ حکم کرو، ہم تو منتظر بیٹھے ہیں۔’’

‘‘آپا پلیز! یہ گھر آپ کا بھی ہے۔ آپ ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔’’

‘‘توبہ، کتنی گھنی اور مکار لڑکی ہے اماں!’’ وہ اسے نظر انداز کر کے مہر بانو سے مخاطب ہو گئی تھیں۔ ‘‘مرتے ہوئے افروز سے سب کچھ اپنے نام کروالیا اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔’’

‘‘آپا! میں نے کچھ نہیں کیا۔ اور مجھے تو علم تک نہیں کہ افروز نے یہ سب کچھ کب اور کس وقت کیا۔’’ اور آپا اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے ہنسنے لگی تھیں۔ عجب تمسخر اُڑاتی ہنسی تھی۔

‘‘بچہ تو اب ہے نہیں اماں! اور جو کچھ اس کے نام ہے، وہ بھی کیا اسے ہی ملے گا؟’’ گھر سے باہر نکلتے نکلتے اس نے سنا۔ شہر بانو اماں سے کہہ رہی تھیں۔

‘‘کیا سوچ رہی ہیں آپ؟’’ وہ سکول کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ‘‘کیا آپ مجھے قابلِ اعتماد نہیں سمجھتیں؟’’

‘‘نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔’’

‘‘پلیز تمکین! مجھ سے اپنی پریشانی شیئر کر لیں۔ کیا خبر کوئی اچھا مشورہ ہی دے سکوں۔ چلیں، کچھ دیر وہاں باغ میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ ابھی آپ کے سکول کے سٹارٹ ہونے میں آدھا گھنٹہ ہے نا، پلیز!’’

اس نے سامنے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں سیب کے کافی درخت تھے۔ ناشپاتیاں بھی تھیں۔ شاید یہ کسی کا باغ ہی تھا۔ اس سے پہلے تمکین نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی تھی۔

‘‘یہ ادھر اپنے گل لالہ (کلینک والے) کی زمین ہے۔ آئیں پلیز!’’

اور تمکین غیر ارادی طور پر اس کے ساتھ چل پڑی اور کچھ دیر بعد اس کے سامنے ایک بڑے پتھر پر بیٹھی وہ سب کچھ اسے بتا رہی تھی۔ افروز کا ذکر کرتے ہوئے آنسو اُس کے رخساروں پر پھسل آئے تھے۔ دانیال مرزا نے بہت خاموشی سے اُس کی ہر بات سنی۔

"ریلیکس تمکین! دراصل یہ لوگ آپ کے ساتھ مخلص نہیں ہیں اور افروز نے اس بات کو جان لیا تھا۔ ہاں، آپ سے بات کرنے کا اسے موقع نہیں مل سکا۔"

"نہیں، ایک بار انہوں نے مجھے نادر بھائی سے محتاط رہنے کو کہا تھا۔ لیکن آپا اور اماں، میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ بھی اتنی خود غرض ہوں گی۔ اور میں، مجھے کیا کرنا ہے دولت اور پراپرٹی۔۔۔ میرا اپنا گھر ہے، ایبٹ آباد میں۔ بہت بڑا اور اچھا۔ میں جاب کر کے اپنی زندگی گزار سکتی ہوں۔ بھلے وہ سب لے لیں، لیکن مجھے اپنی محبتوں سے محروم نہ کریں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کریں مس! اس طرح محبتیں پیسوں سے نہیں خریدی جاسکتیں۔ پہلی فرصت میں عقیل اور انکل شکیل سے رابطہ کر کے انہیں ساری بات بتائیں۔ مجھے ڈر ہے، کہیں وہ لوگ آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔ اور اب میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ پہاڑی سے آپ کو دھکا دینا اور آپ کے پیچھے کسی کو بھیج کر آپ کو خوف زدہ کرنا بھی ان کی سازش ہے۔ بلکہ جیپ میں بھی گڑبڑ انہوں نے ہی کی ہو گی۔"

"میرا اپنا تو اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ اور افروز کے حوالے سے جو رشتے بنے تھے، میں ہمیشہ ان رشتوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔" اس نے جیسے دانیال کی بات سنی ہی نہ تھی۔

"زندگی ایسے ہی نہیں گزرتی۔ چلیں اُٹھیں۔ اس وقت سکول جائیں۔ ٹائم ہو گیا ہے اور ابھی لوگوں کی اس طرف آمدورفت بھی شروع ہو جائے گی، سو پھر بات کریں گے۔ لیکن پلیز، گھر جاتے ہی عقیل سے بات کریں۔ وہ پورا خاندان آپ کا خیر خواہ اور ہمدرد ہے۔ افروز کو ان پر ٹرسٹ تھا۔ اس لئے تو افروز نے انہی کے سپرد سب کچھ کیا ہے۔"

تمکین سر ہلا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ سکول کے احاطے کے پاس پہنچ کر دانیال نے آہستگی سے کہا۔

"آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں تمکین! میں تو صرف آپ کی ہی خاطر یہاں رکا ہوا ہوں۔" وہ اپنی بات کر کے رکا نہیں تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سڑک کا موڑ مڑ گیا تو تمکین نے چونک کر گیٹ کے اندر قدم رکھا۔

یہ اس نے ایسا کیوں کہا تھا کہ میری خاطر؟۔۔۔ از حد حیران سی اور اس کے جملے کے معنی اخذ کرتی ہوئی ہیڈ مسٹریس کے آفس کی طرف بڑھ گئی تھی، جوان دو ٹیچرز کا اسٹاف روم بھی تھا۔

VVV

"یہاں، یہاں دستخط کر دو۔"

ایک اسٹام پیپر تمکین کے سامنے رکھتے ہوئے نادر خان نے کہا تو تمکین نے جو نادر خان کے یوں اچانک کمرے میں آجانے پر حیران سی اسے دیکھے جا رہی تھی، اسٹام پیپر ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"مختار نامہ ہے۔" نادر خان نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"کیسا مختار نامہ؟"

"دیکھو، مارکیٹ اور دکانوں کے کرائے، پراپرٹی کی خرید و فروخت کے لئے تم نے تو نہیں جانا۔ یہ کام کسی مرد نے ہی کرنا ہے۔ اور چونکہ پہلے بھی سب میں ہی سنبھال رہا ہوں اور اب بھی مجھے ہی کرنا ہے سب۔"

"سوری!" تمکین نے اسٹام پیپر جس پر ابھی کچھ لکھا ہی نہیں گیا تھا، اس کی طرف بڑھا دیا۔ "میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ افروز نے سب طے کر کے اپنے وکیل کو بتا دیا تھا۔ آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں۔ انکل شکیل کو انہوں نے میرا مختار بنایا ہے۔"

"اوہ، اچھا۔" نادر خان نے اسٹام پیپر اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بہ مشکل اپنی ناگواری کو چھپایا۔ "میں افروز کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا تھا کہ بہنوئی کے بجائے رشتے کے ماموں پر زیادہ بھروسا کرے گا۔"

"یہ تو وہی بہتر سمجھتے تھے کہ انہوں نے آپ کے مقابلے میں انکل کو کیوں ترجیح دی۔" تمکین بہت کانفیڈنس سے بات کر رہی تھی۔ اور اس کانفیڈنس کے پیچھے عقیل اور انکل شکیل کا سہارا تھا۔ دو دن قبل ہی دانیال نے اس کی عقیل سے بات کروائی تھی۔ اس کا اپنا فون کہیں غائب ہو گیا تھا، بہت ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملا۔

"سکول میں کسی بچے نے پرس سے نکال لیا ہو گا۔ اب گھر میں کہاں ڈھونڈتی پھر رہی ہو؟" آپا بیگم نے اس کے پوچھنے پر جواب دیا تو وہ خاموش ہو گئی تھی اور جب دانیال نے صبح سکول جاتے ہوئے اس سے پوچھا کہ اس نے عقیل کو فون کیا یا نہیں تو اس نے اپنا فون گم ہونے کا بتایا۔ تب دانیال نے عقیل سے اس کی بات کروائی تھی۔ عقیل اور انکل شکیل اپنے کام کے سلسلے میں کراچی میں تھے، تاہم انہوں نے اسے ہر طرح کی تسلی دی تھی اور اپنا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ انکل شکیل نے کہا تھا کہ ایبٹ آباد واپس آتے ہی وہ پھلکوٹ آکر اماں اور آپا سے بات کریں گے اور بوا کو بھی اس کے پاس چھوڑ جائیں گے۔ تاہم حتمی فیصلہ وہاں آکر ہی کیا جائے گا کہ تمکین کو وہاں ہی رہنے دیا جائے یا ایبٹ آباد لے آئیں۔

"افروز بہت نادان اور سیدھا سادہ تھا۔ لوگوں کے مکر و فریب سے ناآشنا۔ اسے بندوں کی پہچان نہیں تھی۔" نادر خان کی نظریں مسلسل تمکین کو اپنے حصار میں لئے ہوئے تھیں۔

"عقیل بھائی اور انکل شکیل کو میں بچپن سے جانتی ہوں۔" تمکین کھڑی ہو گئی۔

"ارے بیٹھو۔۔۔ کہاں جا رہی ہو؟"

"نیچے چائے بنانے۔" تمکین نے ایک قدم آگے بڑھایا تو یک دم کھڑے ہوتے ہوئے نادر خان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ تمکین نے گھبرا کر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"پلیز، میرا ہاتھ چھوڑیں۔"

"اگر میں یہ ہاتھ ہمیشہ کے لئے چاہوں تو۔۔۔؟"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" تمکین نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

"وہی جو تم سمجھ نہیں رہی ہو اور جو میں تمہیں کئی دنوں سے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اور تم ہو کہ کسی اشارے کنایے کو سمجھتی ہی نہیں ہو۔ دیکھو تمکین! تم جوان ہو، خوب صورت ہو، تنہا زندگی کب تک گزارو گی؟ کبھی نہ کبھی تو شادی کرو گی نا۔ تو پھر۔۔۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر تمکین کو دیکھنے لگا۔ "میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ کو شرم نہیں آتی اس طرح کی بات کرتے ہوئے؟ آپا۔۔۔!"

"شہر بانو سے تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے تمکین!" نادر خان نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے اولاد کی خاطر شادی تو کرنی ہے اور شہر بانو کو اجازت دینی ہی پڑے گی۔ اور پھر شہر بانو تو یہاں ہی رہے گی۔ تمہیں میں اپنے ساتھ اسلام آباد لے جاؤں گا۔"

"اور مجھے آپ سے ہرگز شادی نہیں کرنی، سمجھے آپ۔" غصے کی شدت سے تمکین سے بات ہی نہیں کی جا رہی تھی۔

"تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم میری بات مان لو۔" یک دم اس کا لہجہ بدل گیا۔ "اچھی طرح سوچ لینا۔ وہی ہو گا، جو میں چاہوں گا۔"

"میں آپا اور اماں سے کہتی ہوں جا کر۔" وہ تیزی سے مڑی لیکن نادر خان نے لپک کر اس کا بازو سختی سے تھام لیا۔

"ایک لفظ بھی زبان سے مت نکالنا۔ جب مجھے بتانا ہوا، میں خود بتا دوں گا۔"

"کیا بات ہے؟" شہر بانو جو بہت دیر سے لاؤنج میں بیٹھی نادر خان کے نیچے آنے کا انتظار کر رہی تھی، پریشان ہو کر اوپر آ گئی تھی۔

"آپا!" وہ نادر خان سے بازو چھڑا کر دوڑ کر شہر بانو کے قریب آ گئی۔

"یہ۔۔۔ یہ دستخط نہیں کر رہی۔ بہت ہوشیار بنتی ہے۔" اس نے دانت پیستے ہوئے تمکین کی طرف دیکھا۔

"آپا! یہ۔۔۔ یہ نادر بھائی مجھے۔۔۔۔"

"ہاں، ہاں، کہو۔" شہر بانو نے تسلی آمیز انداز میں اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"یہ مجھ سے شادی۔۔۔ نہیں آپا! پلیز نہیں۔ مجھے شادی نہیں کرنی۔"

شہر بانو نے بس ایک نظر نادر خان کی طرف دیکھا، لمحہ بھر کے لئے نادر خان گھبرایا لیکن پھر فوراً ہی ڈھٹائی سے بولا۔

"ہاں تو اس میں کیا برائی ہے؟ چار شادیوں کی اجازت ہے مذہب میں۔ اور پھر میرے پاس تو جواز بھی ہے۔ اولاد کی کسے خواہش نہیں ہوتی۔ اور پھر شہر بانو!۔۔۔۔" وہ دائیں آنکھ کا کونا دبا کر مسکرایا۔ "تم سمجھو نا کہ۔۔۔۔"

لیکن شہر بانو اُس کی بات کا جواب دیئے بغیر واپس مڑ گئی اور وہ اسے پکارتا ہوا اس کے پیچھے ہی سیڑھیاں اُترنے لگا۔

"سنو۔۔۔۔ سنو تو شہر بانو!۔۔۔۔"

اور تمکین بے دم سی ہو کر بیڈ پر گر گئی۔ وہ یک دم ہی بہت خوف زدہ ہو گئی تھی۔ یہاں اس گھر میں کوئی بھی اس کا اپنا نہیں تھا اور کوئی بھی اسے نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اسے ایبٹ آباد بوا کے پاس چلے جانا چاہیئے۔

'افروز!۔۔۔۔ افروز! آپ کیوں چلے گئے مجھے چھوڑ کر؟'

بہت دنوں بعد آج وہ پھر رو رہی تھی۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک وہ یونہی روتی رہی، پھر اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور خاموشی سے آکر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ تب ہی دلبر دستک دے کر اندر آگیا۔

"اماں پوچھ رہی ہیں چائے اوپر ہی بھجوا دوں؟" اس نے بلند آواز میں پوچھا تھا۔ اور پھر جیب سے ایک موبائل فون نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ دانیال صاحب نے دیا ہے۔" اس نے بے حد آہستگی سے کہا۔ "آپ کا فون گم ہو گیا تھا، اس لئے۔" فون دے کر وہ رکا نہیں تھا بلکہ تیزی سے واپس چلا گیا۔ لیکن جاتے جاتے باآواز بلند چائے جلدی لانے کا کہہ گیا تھا۔

وہ کچھ دیر تک فون دیکھتی رہی۔

'اچھا خوب صورت سیٹ ہے۔ خیر کل تو چھٹی ہے، پرسوں پے منٹ کر دوں گی۔'

اس نے فون تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ ایک لمحے کے لئے خیال آیا کہ دانیال کو فون کر کے اس کا شکریہ ادا کر دے۔ اس نے اپنا نام اس میں Save کر دیا تھا۔ لیکن پھر سوچا کہ من ڈے کو ہی شکریہ ادا کر دے گی۔

عجیب آدمی ہے۔۔۔۔ اُس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔ بغیر کسی تعلق اور رشتے کے خوا مخواہ میں اس کا محافظ بن بیٹھا ہے۔ بہر حال، اچھا آدمی ہے اور اس کے یہاں ہونے سے اپنے اکیلے پن کا اتنا احساس نہیں رہا۔ لیکن یہ بھی کب تک رکے گا؟ بالآخر تو اسے جانا ہی ہو گا۔ اور شاید اماں اور آپا بھی لاہور چلی جائیں۔ پھر۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔ اے کاش! وہ ہی زندہ ہوتا تو اس کے سہارے زندگی گزر جاتی۔ دو ننھے منے ہاتھوں کا لمس اسے اپنے رخساروں پر محسوس ہوا۔ تصور میں پیارا سا بچہ قلقاریاں مارنے لگا تو وہ مضطرب سی ہو کر ٹیرس پر آگئی اور نیچے آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے لگی۔

VVV

تمکین بے حد مضطرب سی، کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھی۔ دو ایک بار اس نے باہر ٹیرس پر بھی جا کر دیکھا تھا۔ سامنے دانیال مرزا کے کمرے کا ٹیرس ویران پڑا تھا۔ پتہ نہیں وہ کہاں چلا گیا ہے۔ شاید واپس۔ آخر کوئی کب تک بے مقصد اجنبی جگہ پر ٹھہرا رہے؟ آج سنڈے تھا، لیکن ابھی تک دلبر اور لندن بی بی نہیں آئے تھے۔

اُس نے کمرے میں ہی الیکٹرک کیٹل میں اپنے لئے چائے بنائی تھی۔ نیچے ابھی تک خاموشی تھی۔ شاید آج آپا ابھی تک چائے کے لئے نہیں اُٹھی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں، اُسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات ہے، کیا کچھ ہونے والا ہے۔

وہ چلتے چلتے بیٹھ گئی۔ تبھی ہلکی سی بیپ ہوئی تو اس نے تکیہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کے فون کی اسکرین روشن تھی۔ دوسری طرف دانیال تھا۔

''ہیلو، کیسی ہیں آپ؟''

''تھینک گاڈ۔۔۔ کہاں تھے آپ؟'' اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا

''کیوں، خیریت ہے تمکین؟'' وہ یک دم سنجیدہ ہو گیا۔ 'میں ایبٹ آباد میں ہوں۔ شام تک آجائوں گا۔ لیکن آپ ٹھیک ہیں نا؟''

''جی۔'' تمکین نے اس کی آواز سن کر بے حد طمانیت سی محسوس کی تھی۔

''لیکن آپ کچھ گھبرائی ہوئی سی ہیں۔ میں نے خود سے فون اس لئے نہیں کیا تھا کہ پتہ نہیں دلبر نے آپ کو فون دیا ہے ابھی یا نہیں۔ مجھے آپ کے فون کا انتظار تھا۔'' وہ حسب معمول تیز تیز بول رہا تھا۔

''جی وہ فون تو کل شام مل گیا تھا۔''

''پھر آپ نے فون کیوں نہیں کیا؟''

''بس یونہی، خیال نہیں آیا۔''

''فی الحال میں نے اپنی ہی سم ڈال دی ہے اس میں۔ من ڈے کو آپ سکول جائیں گی تو اپنے شناختی کارڈ کی کاپی وغیرہ لے آیئے گا۔ آپ کے نام سے کنکشن لے لیں گے۔''

''جی۔۔۔۔''

‘‘آپ خاموش ہیں۔ کوئی مسئلہ تو نہیں؟اور ہاں، اپنا فون دوسروں کی نظر سے چھپا کر ہی رکھئے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ آپ کا پہلا موبائل بھی کسی نے گھر میں ہی غائب کیا ہے، اسی لئے میں نے فوراًجوں ہی مجھے یہ خیال آیا، آپ کو فون بھجوا دیا ہے تاکہ کسی ایمرجنسی میں آپ کال کر سکیں۔’’

‘‘لیکن اگر کال سے پہلے ہی کچھ ہو گیا تو؟’’

‘‘مائی گاڈ تمکین! تم بتاتی کیوں نہیں ہو، کیا بات ہے؟ کیا پھر کسی نے۔۔۔۔’’ وہ پریشان ہو گیا۔

‘‘مجھے ڈر لگ رہا ہے۔’’

‘‘کیوں؟’’ دوسری طرف سے وہ بے حد بے چین سا ہو گیا تھا۔ تب تمکین نے نادر خان سے ہونے والی گفتگو اسے بتادی۔

‘‘وہ کیسا پیپر تھا؟ تم نے پڑھا؟’’

‘‘سادہ تھا۔’’

‘‘دیکھو، کبھی بھی کسی پیپر پر دستخط مت کرنا۔ میں تو تمہارے لئے اجنبی ہوں، لیکن تم فوراً عقیل کو فون کر دو۔ تمہارا اب یہاں رہنا بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔’’

‘‘میں نے انہیں فون کیا تھا۔ لیکن شاید انہیں چند دن لگ جائیں گے یہاں آنے میں۔ اس لئے میں نے انہیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔’’

‘‘تو تم ایسا کرو، منڈے کو سکول جانے کے لئے نکلو تو اپنی بے حد ضروری چیزیں ایک بیگ میں ڈال کر ساتھ لے لینا۔ میں تمہیں ایبٹ آباد پہنچا دوں گا۔’’

‘‘لیکن میں یہاں رہنا چاہتی ہوں۔ اس گھر میں، جہاں افروز کے ساتھ۔۔۔۔’’

!تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ دستخط کروانے کے لئے وہ تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں

یہ گھر تمہارا ہے اور تم سے کوئی نہیں لے سکے گا۔ لیکن اس وقت تمہیں وہاں نہیں رہنا چاہئے۔’’

‘‘تو ٹھیک ہے، پھر میں آج ہی ایبٹ آباد آجاتی ہوں۔ یہاں سے گاڑی تو جاتی ہے۔’’

‘‘اوکے۔۔۔۔ کوئی مسئلہ ہو تو فون کر دینا۔ ٹیک کیئر۔’’

فون آف کر کے تمکین نے میٹرس کے نیچے رکھ دیا اور پھر چند جوڑے کپڑے اور ضروری اشیائ، کاغذات وغیرہ ایک بڑے بیگ میں ڈالے اور بیگ کو بیڈ کے نیچے رکھ کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

خلافِ معمول شہر بانو لائونج میں نہیں تھی۔ وہ مہر بانو کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ کھولا تھا، شہر بانو سامنے ہی صوفہ چیئر پر دونوں پائوں رکھے بیٹھی تھی۔

اس نے سلام کیا اور مہر بانو کی طرف دیکھا۔

‘‘اماں! میں کچھ دنوں کے لئے ایبٹ آباد جا رہی ہوں۔ بوا کے لئے دل اداس ہو رہا ہے۔’’

"ہاں ہاں، چلی جاؤ۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا تمہیں۔" مہربانو فوراً بولیں تو شہربانو نے تند نظروں سے انہیں دیکھا۔

"دلبر آتا ہے تو اسے ساتھ لے جاؤ۔" مہربانو نے شہربانو کی نظروں کی تندی کو اگنور کرتے ہوئے کہا تو شہربانو فوراً بولیں۔

"دلبر اور لندن بی بی چھٹی پر ہیں آج۔ اور تمکین! تم ناشتہ بنالو۔ لیکن پہلے چائے۔ میں نے ابھی تک چائے بھی نہیں پی۔ نادر صبح سویرے اسلام آباد چلا گیا تھا، اس کے بعد میں سو ہی نہیں سکی۔"

"ناشتہ تم خود بنالو شہربانو! اسے ایبٹ آباد جانا ہے۔ دیر ہو گئی تو اسے سواری نہیں ملے گی۔"

"اچھا۔۔۔" شہربانو نے اچھا کو لمبا کرتے ہوئے تمکین کو مخاطب کیا۔

"آج اچانک ایبٹ آباد جانے کی کیا سوجھی تمہیں؟ چپکی بیٹھی رہو، کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن آپا! میں۔۔۔" تمکین نے کچھ کہنا چاہا مگر شہربانو نے ٹوک دیا۔

"تم ایبٹ آباد نہیں جاؤ گی۔ اگر جانا ہی چاہتی ہو تو ان تمام کاغذات پر دستخط کر کے جانا، جو میں ناشتے کے بعد تمہیں دوں گی۔"

"لیکن اگر میں جانا چاہوں تو آپ مجھے کیسے روک سکتی ہیں؟" تمکین نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

"جانے کی کوشش کر کے دیکھ لو۔"

"شہربانو! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ اور کیسے دستخط۔ تم نے مجھ سے دستخطوں کی تو کوئی بات نہیں کی۔"

"اماں! آپ چپ رہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر بات آپ سے کی جائے۔"

"شہربانو! تم کیا کر رہی ہو؟ میں نے تمہیں سمجھایا بھی تھا۔"

'اوہو اماں! آپ چپ نہیں رہ سکتیں۔ میں جانتی ہوں مجھے کیا کرنا ہے۔ اور تمکین! تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟ جاؤ، جا کر ناشتہ بناؤ۔"

تمکین نے ایک نظر انہیں دیکھا اور باہر نکل آئی۔ کچن کی طرف جانے سے پہلے وہ انٹرنس کی طرف گئی۔ گیٹ پر بڑا سا تالا لگا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ایک اطمینان بہرحال اسے تھا کہ اس کے پاس فون ہے اور وہ ابھی عقیل کو اور دانیال کو فون کر سکتی ہے۔ اس نے خاموشی سے چائے اور ناشتہ تیار کر کے شہربانو اور اماں کے سامنے رکھ دیا۔ اسے مہربانو افسردہ سی لگی تھیں۔ لیکن وہ وہاں رکی نہیں تھی۔

"سنو۔۔۔ ٹی وی پر فائل پڑی ہے، لیتی جاؤ۔ اور جہاں جہاں نشان لگے ہیں، دستخط کر دو۔" شہربانو نے اسے روکا۔

"اگر میں دستخط نہ کروں تو؟" تمکین نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

"تو۔۔۔" شہربانو مسکرائی۔ "تو پھر کل یا پرسوں کسی وقت نادر خان تم سے نکاح پڑھوالے گا، زبردستی۔"

"پاگل ہو گئی ہو، شہر بانو؟ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مت مارو۔" مہر بانو بے اختیار بول پڑی تھیں۔ "ارے وہ تمہیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر کرے گا۔"

"اماں! میں نے آپ کو کہا تھا نا کہ میرے معاملے میں مت بولیں۔"

رات نادر خان نے اسے سمجھایا تھا کہ یہ شادی یا نکاح تو صرف تمام پراپرٹی اور پیسہ ہتھیانے کے لئے ہے۔ سب ہاتھ میں آتے ہی طلاق دے دوں گا۔ لیکن مہر بانو کو اس کی بات کا یقین نہ تھا۔

"جھوٹ بولتا ہے۔"

"اماں! تمہیں خوامخواہ ہمدردی کا بخار چڑھا ہے۔ ہوتی کون ہے وہ، چار دن بیوی بن کر رہی اور کروڑوں کی جائیداد کی مالک بن رہی ہے۔ ہوا تک نہیں لگنے دی، میسنی نے اور سب کچھ اپنے نام کروالیا۔"

اب کے تمکین نے اس کی بات کا جواب نہ دیا تھا اور واپس مڑ کر کچن میں آگئی تھی۔ اپنا چائے کا کپ اٹھا کر وہ کچھ دیر وہاں ہی کھڑی رہی، پھر لائونج سے فائل لئے بغیر اوپر اپنے کمرے میں آگئی۔ مہر

بانو اور شہر بانو کسی بحث میں اُلجھی ہوئی تھیں۔

چائے پیتے ہوئے تمکین مسلسل سوچ رہی تھی کہ خاموشی سے دستخط کر دے اور واپس ایبٹ آباد چلی جائے اور باقی ماندہ زندگی وہاں ہی گزار دے، افروز کی یادوں کے ساتھ۔ افروز نہیں رہا تھا تو اسے دولت اور پراپرٹی کی بھی کیا ضرورت تھی۔ وہ جس کا مستقبل محفوظ کرنا چاہتا تھا، وہ تو نہیں رہا تھا۔ اب تو اسے یقین ہو چلا تھا کہ

اسے دھکا دینے میں آپا اور نادر خان کا ہی ہاتھ ہو گا۔ وہ ایبٹ آباد جا کر اپنی جاب اسٹارٹ کر سکتی تھی۔ زندگی بہت سکون سے گزر جاتی۔

وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر کے اُٹھی ہی تھی کہ اسے محسوس ہوا جیسے بیپ ہوئی ہو۔ اس نے میٹرس کے نیچے سے فون نکالا۔

"کب سے کر رہا ہوں۔ کیا تم گھر سے نکل آئی ہو؟" دانیال مرزا پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔ آج وہ مسلسل اسے تم کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ لیکن تمکین نے غور نہیں کیا تھا۔ اب جبکہ وہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو چکی تھی تو ذرا سی چونکی۔

"تم خاموش کیوں ہو؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟"

تب اس نے ساری تفصیل بتا دی۔ دانیال نے ایک گہری سانس لی۔

"دیکھو، کوئی حماقت مت کرنا۔ ہو سکتا ہے تم دستخط کر دو اور وہ تمہاری زندگی۔۔۔ نہیں، دیکھو تم یوں کرنا، عقیل یا اپنے انکل شکیل سے رابطہ کر کے ساری بات بتائو۔ میں شام تک پہنچ جائوں گا۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے ٹیرس سے دائیں طرف ٹیلے کی اونچائی سے اگر میں کوشش کروں تو میرا ہاتھ ریلنگ تک پہنچ جائے گا اور۔۔۔"

تمکین کو ہنسی آگئی۔

"یہ کوئی فلمی اسٹوری نہیں ہے۔ میں۔۔۔۔ مجھے کسی دولت، جائیداد کا لالچ نہیں ہے۔ میں بس یہاں اس گھر میں رہنا چاہتی تھی، جہاں میں نے زندگی کے آخری لمحے تک رہنے کا خواب دیکھا تھا۔ لیکن بس۔۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔ "لیکن پلیز! تم اپنے وکیل اور عقیل سے تو بات کر لو۔ وہ تمہارے خیر خواہ ہیں نا۔۔۔۔ میں تو اجنبی ہوں، میری بات بھلے نہ مانو۔" لہجے کی ناراضی نے ایک لمحے کے لئے تمکین کو حیران کیا، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ نارمل انداز میں کہہ رہی تھی۔

"آپ پلیز، میری خاطر اپنا کام ادھورا چھوڑ کر مت آئیں۔ میرے خیال میں جب میں ان کا مطالبہ پورا کر دوں گی تو پھر میرے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"پھر بھی خطرہ ہے۔ بلکہ زیادہ خطرہ ہے۔" وہ جھنجلایا۔ "ان لالچی لوگوں کو دینے کے بجائے بہتر ہے کہ تم سب کچھ ایدھی کو ڈونیٹ کر دو۔ کسی کا بھلا ہو جائے گا۔"

"ہاں، اگر یہ سب کچھ میرے پاس رہتا تو ایسا ہی کرتی۔ اوکے، آپ کا شکریہ، آپ نے اتنا خیال رکھا۔"

"ویلکم۔" اس نے یک دم ہی کسی قدر غصے سے کہہ کر فون بند کر دیا تو تمکین کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔

'عجیب آدمی ہے۔۔۔۔ بغیر کسی تعلق اور رشتے کے خوامخواہ ہی۔۔۔۔'

اس نے فون اور چارجر اٹھا کر وارڈروب میں کچھ کپڑوں کے نیچے رکھ دیا اور سائیڈ ٹیبل سے ایک کتاب اٹھا کر پڑھنے لگی۔ بظاہر وہ مطمئن تھی، لیکن اندر کہیں اضطراب تھا، جس کی وجہ سے وہ پوری توجہ سے پڑھ نہیں پا رہی تھی۔

اُس نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور افروز سے شادی کے پہلے روز سے لے کر اب تک کے سارے واقعات دل ہی دل میں دہرانے لگی۔ کبھی اس کی آنکھیں چمکتیں، لبوں پر مسکراہٹ بکھرتی اور کبھی وہ بے حد اُداس ہو جاتی اور آنکھیں نم ہو جاتیں۔ یونہی سوچتے سوچتے نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ اسے احساس ہی نہ ہوا۔ چونکی تو اس وقت جب شہر بانو دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں فائل تھی۔ تمکین نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"رکھ دیں آپا! میں دستخط کر دوں گی۔"

شہر بانو کی آنکھوں میں پہلے حیرت اور پھر چمک سی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے فائل سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

'پتہ نہیں، لوگوں کو دولت کی اتنی ہوس کیوں ہوتی ہے۔'

اُسے عمر بن عبدالعزیز کا واقعہ یاد آ رہا تھا، جو اس نے شاید کورس کی کسی کتاب میں پڑھا تھا۔ جب انہوں نے اموی امراء سے کہا تھا کہ جب پیٹ کی بھوک مٹھی بھر بھنے ہوئے چنوں سے مٹ سکتی ہے تو پھر ان لوگوں کی املاک چھین کر جہنم کی آگ سے پیٹ کیوں بھرتے ہو؟

''تمہارا موبائل ملا؟'' شہر بانو نے پوچھا تو تمکین نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ اس وقت اس عورت سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یکا یک ہی اس کے اندر اذیت کی لہریں سی اُٹھنے لگی تھیں۔

''تو پھر اپنا چارجر دے دو۔ میرا نہیں مل رہا۔''

تمکین نے بنا بولے دراز سے چارجر نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

''دو دن تک شاید نادر آجائیں تو پھر تم ایبٹ آباد چلی جانا۔'' چارجر ہاتھ میں لے کر شہر بانو نے تمکین کی طرف دیکھا لیکن تمکین ان کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں اپنے ہاتھوں پر تھیں۔

''تمہیں کوئی بھی اچھا لڑکا مل سکتا ہے۔ اور تم اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کر سکتی ہو۔ نادر کے ساتھ شادی کر کے اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ یہاں اس گھر میں رہ سکتی ہو تو یہ تمہاری غلط فہمی ہو گی۔ نادر۔۔۔۔ خیر، تم خود عقل مند ہو اور یہ تمہارے فیصلے سے پتہ چل رہا ہے۔''

انہوں نے ایک گہری نظر تمکین پر ڈال کر کچھ کھوجنے کی کوشش کی لیکن تمکین کا چہرہ سپاٹ تھا اور وہ بدستور اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

شہر بانو کچھ دیر اسے خاموش نظروں سے دیکھتی رہی، پھر واپس مڑی۔

'کیا تمکین سچ مچ اس فائل پر دستخط کر دے گی؟ پڑھی لکھی لڑکی ہے، ہوشیار اور چالاک۔ اور فرض کیا وہ سب کاغذات پر دستخط کر بھی دیتی ہے اور یہاں سے ہمیشہ کے لئے چلی بھی جاتی ہے تو کیا وہ۔۔۔۔ جو افروز کے

رشتے دار ہیں، اور جو اس کا وکیل ہے، وہ کوئی پھڈا تو نہیں ڈالیں گے؟' وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

'شکر ہے، وہ فتنہ تو دنیا میں آنے سے پہلے ہی ختم ہوا۔ افروز کی جائیداد کا شرعی اور قانونی وارث۔ اور اگر یہ بھی مر کھپ جائے کہیں تو پھر کون دعوے دار ہو گا اس ساری جائیداد کا؟' اُن کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

'اور یوں بھی اماں کہتی ہیں، نادر کی نظر ہے اس لڑکی پر۔ کہیں اپنا گھر نہ اُجاڑ بیٹھنا۔ اور اس نادر کو تو میں دیکھ لوں گی۔ کنگلا، بدنیت۔ میری اور اماں کی دولت پر عیش کر رہا ہے۔'

وہ نیچے لائونج میں رکنے کے بجائے باہر نکل گئی تھیں۔ لیکن وہ اندر لگا ہوا بڑا سا تالا باہر لگانا نہیں بھولی تھیں۔

VVV

''یہ سفید برف سے ڈھکا پہاڑ، ملکہ پربت ہے۔''

افروزاسے بتارہاتھااور وہ ملکہ پربت کو دیکھ رہی تھی۔اس کی نظریں جھیل کے پانی پر تھیں اور اس کی آنکھیں اس انہونی خوشی سے دمک رہی تھیں، جو کسی نئی چیز کی دریافت سے ہوتی ہے۔

"افروز! کیا یہاں سچ مچ شہزادہ سیف الملوک آتا ہوگا؟"

وہ پوچھ رہی تھی۔لیکن افروز اُس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔وہ سامنے کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے بیٹھا تھا اور اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی تھیں۔

"کیا ہوا ہے؟آپ یک دم اتنے چپ اور اُداس کیوں ہوگئے ہیں؟" اس نے افروز کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

"ہاں، تمکین!۔۔۔سوچ رہا ہوں کہ تمہیں اب چلے جانا ہے۔"

"کہاں؟۔۔۔میں نے کہاں جانا ہے؟" وہ چونک کر پوچھ رہی تھی لیکن افروز اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔پھر یکایک اس نے تمکین کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور کچھ دیر یونہی اسے دیکھتا رہا۔

"تمو! یہی بہتر ہے۔" اس نے اپنے ہاتھ نیچے کرلئے اور ایک دم اُٹھ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

وہ وہاں ہی جھیل کنارے بڑے پتھر پر بیٹھی اسے جاتا دیکھتی رہی۔پھر یکایک اسے احساس ہوا کہ وہ وہاں اکیلی بیٹھی ہے تو وہ گھبرا کر اُٹھی اور افروز کو پکارتی اُس کے پیچھے بھاگی۔بھاگتے ہوئے کسی پتھر سے ٹھوکر کھا کر وہ

گری اور اُس کی آنکھ کھل گئی۔کچھ دیر تو وہ یونہی خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھتی رہی۔یہ اُس کا بیڈ روم تھا اور افروز اس کے پاس نہیں آیا تھا۔وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

سامنے کلاک پر نظر پڑی۔دو بج رہے تھے۔

'تو کیا میں اتنی دیر سوتی رہی ہوں؟'

سائیڈ ٹیبل پر وہ فائل ویسے ہی پڑی تھی، جو شہر بانو چھوڑ کر گئی تھیں۔اسے یاد آیا کہ صبح ناشتہ کے بعد آپا نے یہ فائل اس کے کمرے میں چھوڑی تھی۔اسے اپنے اندر اذیت کی لہریں اُٹھتی محسوس ہو رہی تھیں اور پھر پتہ نہیں کب وہ اس درد کو برداشت کرتے ہوئے سو گئی تھی۔پھر یہ خواب۔۔۔اور ایسے خواب تو وہ سینکڑوں دیکھ چکی تھی۔وہ اور افروز بالا کوٹ میں۔۔۔کاغان میں۔۔۔ناران میں۔۔۔

وہ دن بھر دل ہی دل میں افروز کے ساتھ گزرے ہر لمحے کو دہراتی تھی اور رات میں خواب بھی دیکھتی تھی لیکن آج کا خواب۔۔۔آج کا خواب کچھ مختلف تھا۔آج سے پہلے تو اس نے وہی دیکھا تھا، جو گزر چکا تھا، لیکن آج۔۔۔آج افروز نے کچھ مختلف بات کی تھی، جو پہلے نہیں کی تھی۔تو کیا افروز بھی چاہتا ہے کہ میں یہاں سے چلی جاؤں؟

دل پھر کٹنے لگا۔۔۔یہ کمرا کتنا مانوس اور اپنا اپنا سا ہو گیا تھا۔وہ اُٹھی۔پیٹ میں اینٹھن سی ہوئی۔صبح ناشتے میں اس نے صرف چائے ہی لی تھی۔اس نے دروازہ کھولا، لیکن پھر رک گئی۔باتھ لے کر چینج کرلوں۔اور

پتہ نہیں، آپا نے کچھ پکایا بھی ہے یا نہیں۔ کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔ اُس نے خود ہی تردید کی۔ ورنہ آپا مجھے جگا کر پکانے کے لئے کہتیں۔

وارڈروب کھولا تو بیپ کی آواز آرہی تھی۔ اس نے کپڑے ہٹا کر موبائل نکالا۔ دانیال مرزا کی کال تھی اور نہ جانے پہلے کتنی مس کالز آچکی تھیں۔ اس نے پھر موبائل وہیں رکھ دیا۔ اس کا ارادہ کال اٹینڈ کرنے کا نہیں تھا۔ اب جب فیصلہ ہو گیا تھا تو پھر کیا۔

ہاتھ لے کر وہ نیچے آئی تو آپا حسبِ معمول صوفے پر پاؤں رکھے بیٹھی تھیں اور ٹی وی آن تھا۔ وہ ان کی طرف دیکھے بغیر کچن کی طرف بڑھی۔

''کھانا کھا کر دستخط والی فائل لے آنا۔''

کاؤنٹر پر پڑے ڈونگے کا ڈھکن اٹھاتے ہوئے اس نے شہر بانو کو کہتے سنا۔ ڈونگے میں چپلی کباب تھے۔ ہاٹ پاٹ میں نان پڑے تھے۔ گویا کھانا وہ باہر سے لائی تھیں۔ اس نے فریج کھولا اور رات کا سالن نکال کر گرم کیا اور ٹرے میں رکھ کر ڈائننگ ٹیبل پر لے آئی اور بہت اطمینان سے کھانے لگی۔ اس کا اطمینان حیران کن تھا۔ شہر بانو نے دو تین بار اسے دیکھا، کچھ بے چینی سی ہوئی اور پھر سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''رات کے لئے چکن بنا لینا۔ اماں سے یہ اتنے مرچوں والے کباب بہ مشکل کھائے گئے۔''

تمکین خاموشی سے کھاتی رہی۔''

''دستخط کر دیئے؟''

''کر دوں گی۔'' تمکین نے ان کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

''ویسے یہ کس طرح کے کاغذات ہیں اور کس مقصد کے لئے ہیں؟'' کھانا کھا کر اس نے شہر بانو سے پوچھا۔

''پتہ نہیں، نادر خان ہی جانتا ہے۔'' شہر بانو نے چونک کر جواب دیا۔

''تو پھر بھائی صاحب آئیں گے تو تب کر دوں گی دستخط۔ فی الحال مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ۔۔۔۔'' تمکین نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''بتایا تو تھا تمہیں کہ جہاں دستخط۔۔۔''

''ٹھیک ہے۔'' تمکین برتن اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی۔

''یہ لڑکی۔۔۔۔ مجھے اس کی کچھ سمجھ نہیں آرہی ہے۔'' شہر بانو نے دانت کچکچائے اور اپنا فون اٹھا کر نادر خان کو فون کرنے لگیں۔

تمکین ان کے پاس سے گزر کر اوپر اپنے کمرے میں آگئی اور ایک بار پھر وہ اپنے کمرے میں موجود ہر چیز کو دیکھ رہی تھی، چھو رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی۔ افروز کے کپڑے، اس کی کتابیں، جوتے، ہر چیز کو اس نے بار بار چھوا تھا اور آنسو اس کے رخساروں پر بہت آہستگی سے بہتے رہے تھے۔

VVV

رات کا جانے کون سا پہر تھا، جب اس کی آنکھ کسی شور سے کھلی تھی اور یہ شور ٹیرس سے آرہا تھا۔

وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ نائٹ بلب کی مدھم سی روشنی میں اس نے دیکھا، ٹیرس کے دروازے کی چٹخنی کھلی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا، سونے سے پہلے اس نے چٹخنی بند کی تھی۔ پھر یہ کیسے کھلی تھی؟

سونے سے پہلے شہر بانو اس سے فائل لینے آئی تھیں۔ مختلف اسٹام پیپرز پر بغیر پڑھے اس نے سائن کر دیئے تھے۔ یک دم ہی ہر چیز سے اس کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ کس کے لئے اور کیوں وہ لڑے؟ آپا کے سامنے ہی وہ کچھ دیر کے لئے واش روم گئی تھی اور جب وہ باہر آئی تھی تو شہر بانو، ٹیرس کے دروازے کے پاس کھڑی تھیں۔ تو کیا آپا نے؟۔۔۔اُس نے جھرجھری سی لی۔ اُس کا پورا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔

اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے ٹیبل لیمپ کو جلایا۔ پورا کمرہ روشن ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ٹیرس کا دروازہ زور سے کھلا تھا اور دو شخص ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتے ہوئے اندر گرے تھے۔ اُس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اور پھر وہ بے ساختہ چیختی چلی گئی۔

نیچے گرے ہوئے شخص کی کنپٹی پر ایک مکا رسید کرتے ہوئے دوسرا شخص کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ تبھی ہاتھ میں ماؤزر لئے دانیال نے اندر قدم رکھا۔

''سب ٹھیک ہے تمکین! حوصلہ کرو۔''

دانیال کو دیکھ کر تمکین کی چیخیں رک گئی تھیں لیکن وہ حیرت سے ان تینوں کو دیکھ رہی تھی۔

''چاچا! اس کے ہاتھ اسی کی پگڑی سے پیچھے کر کے باندھ دو۔ میں نے گل لالہ کو فون کر دیا ہے۔ وہ تھانیدار کو ساتھ لے کر آرہا ہے۔'' دانیال دوسرے شخص سے مخاطب تھا۔

''تو یہ ہے (گالی دے کر) ڈاکہ ڈالنے آیا تھا۔ بے غیرت۔''

''میں چور نہیں ہوں۔'' ہاتھ بندھواتے ہوئے اس نے زمین پر تھوک دیا۔ تمکین ساکت بیٹھی تھی۔ دانیال نے فون پر کسی سے بات کی، پھر اس کے بیڈروم کا دروازہ کھول کر وہ دونوں اس شخص کو گھسیٹتے ہوئے نیچے لے گئے۔ باہر کسی جیپ کے رکنے کی آواز آئی تھی اور ساتھ ہی شہر بانو اور مہر بانو کی اونچی اونچی آوازیں۔

تمکین نے اُٹھنا چاہا لیکن اسے لگا، جیسے اس کے جسم میں جان نہیں ہے اور وہ اُٹھ نہ سکے گی۔ وہ وہیں بیٹھی رہی تھی۔ یہ دانیال مرزا یہاں کیسے میرے ٹیرس پر؟ اور وہ شخص کون تھا، جسے وہ مار رہے تھے؟

کچھ دیر بعد شہر بانو ہانپتی کانپتی اوپر آئیں۔

''یہ۔۔۔۔یہ کیا تھا تمکین؟''

"پتہ نہیں۔۔۔۔شاید وہ شخص چوری کی نیت سے آیا تھااور ریسٹ ہائوس سے کسی نے دیکھ لیا۔اب غالباًوہ اسے تھانے لے گئے ہیں۔"

"اوہ ہاں،اچھا۔" وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ تمکین کو لگا جیسے وہ بہت گھبرائی ہوئی سی ہیں۔"تم نے دروازہ بند نہیں کیا تھا؟"

"پتہ نہیں۔۔۔۔شاید کھلا رہ گیا تھا۔"

شہر بانو نے اٹھ کر دروازہ لاک کیا۔

"تین بج رہے ہیں۔" وہ جیسے اپنے آپ سے بولیں۔

"تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو نیچے آجائو۔اماں کے کمرے میں سو جانا۔"

تمکین خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور شہر بانو کے ساتھ نیچے آگئی۔ مہر بانو بھی پریشان سی بیٹھی تھیں۔

"اب نیند تو کیا آئے گی،بہر حال لیٹ جائو۔"

شہر بانو ایک نظر تمکین پر ڈال کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ تمکین نے دیکھا ان کے ہاتھ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔

"اتنا عرصہ ہو گیا یہاں رہتے ہوئے۔پہلے تو کبھی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔افروز کے بابا کے بعد تو ہم دونوں ماں بیٹی اکیلے ہی تھے۔پھر آج۔۔۔۔" مہر بانو نے آہستہ سے کہا۔

"تمکین!تم جتنی جلدی ممکن ہو،یہاں سے چلی جائو۔یہ شہر بانو اور نادر خان دونوں کی آنکھوں پر دولت کی پٹی بندھی ہے۔میں صبح دروازہ کھول دوں گی،جب شہر بانو سو رہی ہو گی۔تم دلبر کو گھر سے لے کر ایبٹ آباد چلی جانا۔"

تمکین نے مہر بانو کی بات سن لی تھی،لیکن کوئی سوال وجواب نہیں کیا تھا اور خاموشی سے دوسرے بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

تو کیا لوگ اتنے شقی القلب اور ظالم بھی ہوتے ہیں؟۔۔۔۔میں نے دستخط کر دیئے تھے تو کیا پھر بھی آپا اور نادر خان مجھے مروانا چاہتے ہیں؟اور وہ شخص کیا مجھے مارنے آیا تھا؟اور کیا دانیال مرزا کا خدشہ صحیح تھا؟اور کیا اماں بھی۔۔۔۔لیکن نہیں،اماں تو بے بس لگتی ہیں،آپا کے سامنے۔'

بہت سی سوچیں تھیں۔بہت سے سوال وجواب تھے،جو خود سے کرتے کرتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

VVV

"تو میں نے تمہیں کتنی ہی بار کال کی۔ لیکن جب تم نے میری کوئی بھی کال اٹینڈ نہیں کی تو میں گھبرا گیا۔ دراصل میں کام ختم نہیں ہوا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ میں شام کے بجائے صبح ہی پھلکوٹ کے لئے روانہ ہوں گا۔ میں نے آخری بار تمہارا نمبر ملایا اور پھر تمہاری طرف سے جواب نہ پا کر اسی وقت وہاں سے چل پڑا اور جب پھلکوٹ پہنچا تو دس بج رہے تھے۔"

آج خلافِ عادت دانیال آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ تمکین اس کے بالکل سامنے بیٹھی خاموشی سے اسے سن رہی تھی۔

"کمرے میں آتے ہی میں نے ٹیرس پر آ کر دیکھا، ٹیرس کے دروازے سے ہلکی سی روشنی آ رہی تھی۔ گویا تم جاگ رہی تھیں۔ میں نے پھر تمہارا نمبر ملایا، لیکن جواب ندارد۔ کیا تم نے فون پھر گم کر دیا تھا؟"

"نہیں، یہ رہا۔ بس میں نے کال اٹینڈ نہیں کی تھی۔" تمکین نے فون پرس سے نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ "آپ اپنا فون لے لیں۔ اور شکریہ بہت آپ کا۔ عقیل بھائی سے میں نے نیا لینے کو کہہ دیا ہے۔"

"یہ میں نے تمہارے لئے ہی لیا تھا تمکین!" دانیال نے گلہ کرتی نظر اس پر ڈالی اور فون واپس اس کے پاس رکھ دیا۔

"میں واپس کمرے کی طرف جا رہا تھا، جب میں نے اسے دیکھا۔ وہ چاروں طرف گھوم پھر کر اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر میں نے اسے دائیں طرف والے ٹیلے پر چڑھتے دیکھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس طرف سے اگر کوئی کوشش کرے تو تمہارے ٹیرس کی ریلنگ پکڑ کر ٹیرس پر آ سکتا ہے۔ پھر میں کافی دیر تک کھڑا رہا۔

لیکن وہ نظر نہیں آیا۔ تب میں نے سوچا شاید وہ شخص دوسری طرف چلا گیا ہو اور مجھے خوامخواہ وہم ہو رہا تھا کہ وہ تمہیں نقصان تو نہیں پہنچانے والا۔ بہرحال، میں سونے کے لئے چلا گیا تاہم میں نے دلبر کے ماموں سے کہہ دیا تھا کہ وہ چوکنا رہے، میں نے ریسٹ ہاؤس کے آس پاس ایک مشکوک شخص کو دیکھا ہے۔ پھر میں سو گیا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب میری آنکھ اچانک کھل گئی۔ کچھ دیر تو میں لیٹا رہا، پھر یونہی اٹھ کر ٹیرس پر آیا اور میں نے اسے دیکھا۔ وہ دائیں طرف سے تمہارے ٹیرس پر چڑھ رہا تھا۔ میں نے خان چاچا کو ساتھ لیا اور پھر۔۔۔"

"آپ کا فلمی ہیرو بننے کا شوق پورا ہو گیا۔" تمکین نے اس کی بات کاٹ دی۔

"سچ ہے بی بی! نیکی کا زمانہ نہیں۔" دانیال نے برا سا منہ بنایا۔ "ویسے یہ خان چاچا ہی نے اسے قابو میں کر کے اس کا ماؤزر چھین کر پھینکا تھا، جسے میں نے اٹھا لیا۔ ورنہ میں اکیلا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔"

"کیا مجھے آپ کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرنا چاہئے؟"

"میں نے تو ایسا نہیں کہا۔" دانیال کو اس کے انداز پر حیرت ہوئی۔

"آپ نے میری جان بچائی۔ کاش نہ بچاتے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"بری بات۔ زندگی بہت خوب صورت ہے۔"

"لیکن میرے لئے نہیں۔"

"زندگی کا سفر تو جاری رہتا ہے تمکین! رک نہیں جاتا۔ اور کیا پتہ کوئی اور ایسا ہو جو آپ کو افروز کی طرح چاہتا ہو اور آپ کی خوشیوں کا متمنی ہو۔"

تمکین نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ ہولے ہولے کہہ رہی تھی۔

"کیا ایسی دنیا میں جیا جا سکتا ہے، جہاں بیوی شوہر کو زہر دے دے اور شوہر بھی وہ جو چچازاد بھی ہو۔ اور پھر ایک سوتیلی بہن، اپنے بھائی کی نسل کو ختم کر دے، اس کی بیوی کو مروانے کی سازش کرے۔۔۔۔ صرف دولت کے لئے، جو آنی جانی چیز ہے۔ جو یہاں ہی رہ جائے گی، اسی دنیا میں۔۔۔۔ میں جینا نہیں چاہتی۔۔۔۔ آپ نے مجھے کیوں بچایا؟" تمکین کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"اس دنیا میں اس سے بھی برا ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ دنیا رہنے کے قابل جگہ ہے۔" دانیال نے نرمی سے کہا۔ "یہاں ہزاروں اچھے لوگ بھی ہیں، دوسروں کے لئے جان دینے والے۔۔۔۔ دولت سے محبت نہ کرنے والے۔"

"پھر بھی، میرا دل نہیں چاہتا جینے کو۔"

"تمکین! اللہ کی دی ہوئی نعمت کو ٹھکرانے سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔ آپ کیا جانیں، اللہ نے یہ زندگی کیوں دی ہے۔ کیا مقصد ہے، کیا کام لینا ہے اللہ نے آپ سے۔۔۔۔ آپ ہیں کہ مسلسل فضول باتیں کر رہی ہیں۔"

"بھلا میری زندگی کس کام کی؟ کون ہے میرا اس دنیا میں؟" تمکین نے سوچا۔

یہ انکشاف کہ وہ شخص آپا کے کہنے پر اسے مارنے آیا تھا، اس کے لئے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ اس نے اعتراف کیا تھا کہ شہر بانو نے اس کے قتل کے لئے اسے دس ہزار روپے دیئے تھے۔

"شہر بانو کے خلاف قتل کا مقدمہ چل سکتا ہے۔" دانیال نے کہا تھا۔ لیکن اس نے انہیں معاف کر دیا۔

"افروز آپ کو آپا کہتا تھا، اس لئے میں آپ کے خلاف کچھ نہیں کر رہی۔ لیکن آپ میرے بچے کی قاتل ہیں، میں روزِ محشر اس قتل کا حساب لوں گی۔"

اس نے ایبٹ آباد آنے سے پہلے شہر بانو سے کہا تھا۔ مہر بانو نے فائل میں موجود سارے کاغذات جن پر اس نے دستخط کئے تھے، پھاڑ دیئے تھے اور ممنون نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"میں اسے روکتی تھی، لیکن۔۔۔۔" وہ بے بسی سے شہر بانو کو دیکھنے لگی تھیں، جو قہر آلود نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

یہ بات مہر بانو نے ہی بتائی تھی کہ اسے دھکا نادر خان نے دیا تھا۔ اور اس سے پہلے شہر بانو نے مختلف دوائیاں اس کے دودھ اور چائے میں ملائی تھیں کہ وہ بچہ دنیا میں نہ آسکے۔ وہ بے حد نادم اور شرمندہ تھیں اور اس کی ممنون بھی۔

"پتہ نہیں، اللہ مجھے میرے گناہ پر معاف بھی کرے گا یا نہیں۔ تم میرے لئے دعا کرنا۔" مہر بانو نے کتنی ہی بار اس سے اپنی بیٹی کے کئے کی معافی مانگی تھی۔

"اماں پلیز! آپ بار بار ایسا کہہ کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ اور پھر آپ کی یہ معافی میرے نقصان کی تلافی نہیں کر سکتی۔" مہر بانو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"جانتی ہوں۔ شہر بانو کا گناہ اور جرم قابلِ معافی نہیں ہے۔ لیکن ماں ہوں نا۔۔۔ اس لئے۔۔۔"

اور وہ انہیں دلاسہ دے کر ان کے سامنے سے ہٹ آئی تھی۔ خود انہوں نے بھی تو افروز کے بابا کو زہر دیا تھا اور یہی وہ بات تھی، جو ان کے منشی دلیر خان نے اس روز افروز کو بتائی تھی اور افروز کو یقین نہیں آیا تھا۔ لیکن دلیر خان نے بتایا تھا کہ یہ بات خود شاہ عالم نے انہیں بتائی تھی کہ انہیں سلو پوائزن دیا جا رہا تھا۔ اور پھر دلیر خان نے ڈاکٹر کے متعلق بھی افروز کو بتایا تھا، جس نے افروز کے بابا کے شک کی تصدیق کی تھی اور ایبٹ آباد میں افروز اس ڈاکٹر سے ملا تھا اور ڈاکٹر نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ انہیں سلو پوائزن دیا جا رہا تھا۔ لیکن جب وہ ان کے پاس آئے تو پھر اس کے بعد کوئی علاج کارگر نہ ہو سکا۔ اور اس بات کی تاکید بھی انہوں نے کی تھی کہ یہ راز، راز ہی رہے۔ وہ اپنے خاندان کا نام اچھالنا نہیں چاہتے۔

انکل شکیل نے اسے یہ سب اس وقت بتایا تھا، جب وہ پھلکوٹ سے ان کے ساتھ آ رہی تھی۔

"افروز کو اس بات کا بہت دکھ تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس کی اماں اور آپا بھی۔۔۔"

انکل شکیل اور عقیل، پھلکوٹ آئے تھے اور انہوں نے مہر بانو اور شہریار کو وکیل کا نوٹس دکھایا تھا، جس کی رو سے یہ گھر تمکین کا تھا۔

"تمکین آپ کے خلاف کوئی کیس نہیں کرنا چاہتی۔ یہ اس کی بڑائی ہے۔ ورنہ اقدامِ قتل کا کیس کیا جا سکتا ہے اور معصوم بچے کے قتل کا بھی۔۔۔ جان شیر کا بیان ہی کافی ہے سزا کے لئے۔" انہوں نے شہر بانو اور مہر بانو سے کہا تھا۔

"فی الحال ہم تمکین کو لے جا رہے ہیں۔ آپ یہ گھر خالی کر دیں۔ جائیداد وغیرہ کی تفصیلات اور تقسیم کے متعلق جاننے کے لئے آپ افروز کے وکیل سے مل لیں اور گھر کی چابیاں دلبر کو دے جائیں۔" انکل شکیل نے ان سے کہا تھا۔

یوں وہ اب پچھلے چھ دن سے ایبٹ آباد میں تھی۔ دانیال نے ابھی کچھ دن پہلے ہی اسے بتایا تھا کہ ان لوگوں نے گھر خالی کر دیا ہے اور۔۔۔ تمکین کو ان کے جانے سے اور گھر خالی کرنے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ وہ یونہی اداس بیٹھی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہیں تمکین؟" اسے اتنی دیر سے خاموش دیکھ کر دانیال مرزا نے پوچھا۔

VVV

"کچھ نہیں۔" وہ چونکی تھی۔

"اب آپ نے کیا سوچا ہے، واپس پھلکوٹ جائیں گی یا ایبٹ آباد میں ہی رہیں گی؟"

"پتہ نہیں۔ میں نے ابھی کچھ نہیں سوچا۔"

"میرے خیال میں تو آپ یہاں ہی رہیں، ایبٹ آباد میں۔"

"کیوں، آپ کو کیا ہے، میں جہاں بھی رہوں۔" وہ جب سے پھلکوٹ سے آئی تھی، بہت چڑچڑی ہو رہی تھی۔

"میرے خیال میں آپ یہاں زیادہ محفوظ ہیں۔" اس نے برا نہیں منایا تھا۔

"لیکن میرے جو دشمن تھے، وہ تو چلے گئے۔ پھر۔۔۔؟" وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"پھر بھی، فی الحال آپ کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔"

"آپ کے مشورے کا شکریہ۔ اور پلیز! اب میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ آپ نے میری مدد کی، میری جان بچائی، اس کے لئے میں آپ کی ممنون ہوں۔ لیکن مجھے خوامخواہ کی ہمدردی نہیں چاہئے۔"

"اوکے۔۔۔" وہ یک دم ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ "چلتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کو میں اتنا برا لگتا ہوں۔"

"سوری!" وہ یک دم شرمندہ سی ہو گئی۔ "مجھے شاید اس طرح بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ لیکن میں۔۔۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ مسکرایا۔ "میں نے آپ کی بات کا برا نہیں منایا۔" اجنبی لہجے میں کہتا ہوا وہ جانے کے لئے مڑا۔

"ارے ارے، بیٹا! بیٹھو تو۔۔۔ میں چائے لا رہی تھی۔"

بوا نے روکا لیکن وہ ان کا شکریہ ادا کرتا ہوا ایک نظر اس پر ڈال کر باہر نکل گیا۔

"بہت اچھا لڑکا ہے۔ مخلص اور محبت کرنے والا۔" بوا نے تمکین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تمکین نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا بیٹا! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" بوا نے پریشان ہو کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"بوا۔۔۔!" تمکین نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ "کیوں ہوا میرے ساتھ ایسا؟۔۔۔ سب مجھے کیوں چھوڑ کر چلے گئے؟۔۔۔ افروز، آپی، ابی جان۔"

وہ رونے لگی تو بوا نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور ہولے ہولے تھپکنے لگی۔ لیکن وہ روئے چلی جا رہی تھی اور لحظہ بہ لحظہ اُس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

VVV

"کیا پھلکوٹ سے جی بھر گیا ہے، جو آپ ایبٹ آباد آ گئے ہیں؟"

"بس کیا بتائیں تمکین بی بی! پھلکوٹ اب ویران سا لگنے لگا ہے۔ سو بوریا بستر باندھ کر یہاں آ گئے۔" دانیال مرزا نے تمکین کی بات کا جواب دے کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ابھی انکل شکیل کے گھر آئی تھی۔ اسے عقیل کے ساتھ بینک جانا تھا اور وہاں دانیال کو دیکھ کر حیران ہوئی۔

"کب آئے آپ یہاں؟" وہ اس کے سامنے والے صوفے پر ہی بیٹھ گئی۔

"میں گیا ہی کب تھا؟" وہ مسکرایا۔ "میرا مطلب ہے، میں تو تبھی ایبٹ آباد آ گیا تھا، جب آپ آئی تھیں۔"

"کیوں، آپ کو کراچی واپس نہیں جانا؟"

"ایسے ہی کیسے چلا جاؤں؟ کوئی امید، کوئی آس کا جگنو تو ہاتھ میں آئے۔"

"آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ کی تحقیق مکمل ہو چکی ہے۔ کیا کچھ سمجھ میں نہیں آیا آپ کو کہ چلغوزوں کے درخت۔۔۔"

"کیا بتائیں آپ کو تمکین بی بی! ابھی تو ہم کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔"

تمکین نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ تبھی عقیل نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا۔

"تم آ گئی ہو تمکین؟ میں تمہاری طرف ہی آ رہا تھا کہ دانیال آ گیا۔"

تمکین کو حیرت ہو رہی تھی کہ صرف پھلکوٹ میں ایک دو ملاقاتوں کے بعد ہی عقیل کی دانیال سے اتنی دوستی ہو گئی تھی کہ دانیال اس کے گھر بھی آنے لگا تھا۔

"دانیال یار! تمکین کو بینک میں کچھ کام تھا۔ مجھے اس کے ساتھ جانا تھا۔ تم رکو اِدھر، چائے وغیرہ پیو، میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔"

"نہیں، کوئی ایسا ضروری کام بھی نہیں ہے عقیل بھائی! ہم کل چلے جائیں گے۔ آپ انہیں کمپنی دیں۔"

"ارے تمو! یہ۔۔۔" عقیل ہنسا۔ "صبح سے شام تک میرے ساتھ ہوتا ہے۔"

تمکین نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"دراصل میں عقیل کو اس کا بزنس سیٹ کرنے میں مدد دے رہا ہوں۔"

"اچھا۔۔۔؟" تمکین کو ہنسی آ گئی۔ "کیا آپ کا کام ہر ایک کی مدد کرنا ہے؟"

"تھینک گاڈ!" دانیال نے آہستگی سے کہا اور بغور اسے دیکھا۔ وہ آج بہت بہتر اور پُرسکون لگ رہی تھی۔ ورنہ عقیل سے اسے پتہ چلتا رہتا تھا کہ وہ بہت ڈسٹرب اور اپ سیٹ ہے۔ اور اگر ایسا تھا تو بالکل نیچرل تھا۔

"یہی سمجھ لیں۔۔۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "بقول آپ کے، خدائی فوجدار۔"

‘‘عقیل بھائی! آپ کو پتہ ہے کہ وہاں پھلکوٹ میں مجھے سکول تک بحفاظت پہنچانے کی ذمہ داری انہوں نے از خود ہی لے لی تھی۔’’ تمکین نے عقیل کو بتایا۔

‘‘یہ تو ساری زندگی۔۔۔۔’’

‘‘اوں ہوں۔۔۔۔’’ دانیال کھنکھارا تو عقیل نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

‘‘تو پھر چلیں؟’’

‘‘ہاں۔’’ تمکین بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

‘‘اگر آپ اجازت دیں تو میں بحفاظت آپ کو بینک تک پہنچا دوں؟’’ دانیال کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

‘‘تم اگر آنا چاہتے ہو ہمارے ساتھ تو آجاؤ۔ ورنہ بینک اتنا دور بھی نہیں ہے یہاں سے۔ پندرہ منٹ کا ہی راستہ ہے۔’’ عقیل نے مڑ کر اسے دیکھا۔

‘‘تو پھر رب راکھا۔’’ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے ٹانگیں پھیلا لیں اور اس کی نظروں نے باہر تک تمکین کا تعاقب کیا۔

VVV

‘‘تمکین! میں سنجیدہ ہوں۔’’ دانیال نے اس کے سامنے پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

‘‘میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔’’ تمکین بھی سنجیدہ تھی۔

‘‘تو اب سوچ لو نا۔’’

‘‘کیا۔۔۔؟’’ تمکین بے دھیانی سے سامنے ریسٹ ہاؤس کے ٹیرس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں اس وقت اس کے گھر کے سامنے والی ڈھلوان پر بیٹھے تھے۔ تمکین کو پھلکوٹ سے کچھ سامان لینا تھا۔ دانیال نے عقیل سے کہا تھا کہ وہ اسے پھلکوٹ لے جاتا ہے۔ یوں بھی اسے وہاں کچھ کام ہے۔

‘‘میرے متعلق۔ اپنے متعلق۔’’ دانیال نے اس کی بے دھیانی نوٹ کی۔

‘‘اب سوچنے کے لئے رہ ہی کیا گیا ہے؟’’ وہ افسردہ ہوئی۔

‘‘کیوں۔۔۔۔ کیا زندگی ختم ہو گئی ہے؟’’ وہ جھنجلایا۔ ‘‘بوا ہمیشہ تمہارا ساتھ نہیں دیں گی۔ پھر باقی کی عمر تنہا گزارو گی؟’’

‘‘ہاں، گزار لوں گی۔ بہت سی لڑکیاں گزار لیتی ہیں۔’’

‘‘ان کی کوئی مجبوری ہوتی ہو گی۔ تمہاری تو کوئی مجبوری نہیں ہے نا۔’’

تمکین نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے، میں ہوں نا تمہاری تنہائی بانٹنے کے لئے۔"

تمکین کو ہنسی آگئی۔

"آپ بھی عجیب ہیں۔اور آپ یہاں بیٹھ گئے۔آپ کو تو کوئی کام تھا۔کام کر آئیں تو پھر واپس بھی جانا ہے۔میں نے تو جو سامان لینا تھا، نکال لیا ہے۔"

"کام بھی ہو جائے گا۔تم پہلے میری بات کا جواب دو۔" وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"آپ کو کوئی کام نہیں تھا اور پہلے بھی جب اس طرح کی کوئی بات ہوتی تھی تو آپ کو کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ آپ صرف میری وجہ۔۔۔" وہ بات کرتے کرتے خاموش ہو گئی۔

"ہاں تو نہیں ہے کوئی کام۔" اس نے تیزی سے کہا۔"تو پھر اس کا کیا مطلب ہے، آپ کی سمجھ میں نہیں آتا؟"

تمکین نے نفی میں سر ہلایا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے آپ سے۔۔۔تم سے محبت ہو گئی ہے۔۔۔سمجھیں آپ۔۔۔اور یہاں میں جھک نہیں مار رہا۔۔۔اچھی بھلی جاب چھوڑ کر آپ کی محبت میں خوار ہو رہا ہوں۔اور اسی محبت۔۔۔" وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش ہو گیا۔

"اور یہ جو تم سمجھ رہی ہو نا کہ میں نے محض ہمدردی میں تمہیں پرپوز کیا ہے تو سن لو، کہ یہ ہمدردی نہیں، محبت ہے۔اور ہمدردی میں کوئی کسی سے شادی نہیں کرتا۔آج کل کے دور میں کوئی ایسا ولی نہیں ہے۔ سمجھیں تم۔یہ تو وہ محبت ہے جو پہلی دفعہ تمہیں دیکھتے ہی دل میں اتر آئی تھی۔اسے ہی شاید کیوپڈ کا تیر چلنا کہتے ہیں۔یہ محض اتفاق تھا کہ میں نے بالاکوٹ کے بجائے پھلکوٹ آنا چاہا تھا اور تب میرے دل میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میں تم سے ملوں گا۔حالانکہ آپی نے مجھے بتایا تھا کہ تم افروز کی وفات کے بعد پھلکوٹ میں ہی ہو اور جب میں نے پہلی بار تمہیں ٹیرس پر کھڑے دیکھا تھا تو تم مجھے۔۔۔۔"

وہ تیز تیز بول رہا تھا اور تمکین ہاتھ گود میں دھرے خاموشی سے اسے سن رہی تھی۔

"بس ایک جھلک ہی میں نے دیکھی تھی اور مجھے یہ تک علم نہیں تھا کہ تم تمکین ہو۔اور تب میں صرف دو روز کے لئے آیا تھا اور مجھے یہاں قیام نہیں کرنا تھا۔لیکن جب میں اپنی ٹیم کے باقی افراد کے ساتھ واپس گیا تو بہت بیزار اور بور ہوا۔جب دو تین ماہ بعد ہمارا کام ختم ہوا اور مجھے واپس جانا چاہئے تھا، لیکن میں واپس جانے کے بجائے ایک بار پھر پھلکوٹ آگیا تھا اور تب مجھے خود نہیں پتہ تھا کہ میں کیوں پھلکوٹ آیا ہوں۔اور اس بار دلبر سے مجھے پتہ چلا تھا کہ تم تمکین ہو۔۔۔افروز کی بیوہ۔اور یہ کہ تمہاری آپی کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔میں تسکین آپی سے صرف ایک بار ملا تھا، لیکن مجھے بہت دکھ ہوا۔وہ زندہ ہوتیں تو شاید میں ایک بار پھر اس عہد کو نبھانے کی کوشش کرتا، جو میرے بابا نے تمہارے ابی جان سے کیا تھا۔"

تمکین کو یہ بات چند دن پہلے ہی بوا نے بتائی تھی کہ دانیال، مرزا سعادت بیگ کا بیٹا ہے اور شہزادہ اسے پیار سے بلایا جاتا ہے اور وہ تسکین کی زندگی میں، جب وہ پھلکوٹ میں تھی اسے ملنے آیا تھا۔

"وہ عہد تو ابی جان اور آپ کے باباجان کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا تھا اور پھر میں۔۔۔آپ کی بات میں نے سمجھ بھی لی ہے اور مجھے آپ کے خلوص اور محبت سے انکار نہیں۔ لیکن میں نے شادی کے متعلق بالکل نہیں سوچا۔"

"تو اب سوچ لو نا، یار!" وہ ذرا سا ریلیکس ہوا۔ "میں برا آدمی نہیں ہوں۔"

"میں نے ایسا تو نہیں کہا۔ لیکن میں ابھی خود کو ذہنی طور پر شادی کے لئے تیار نہیں کر پاؤں گی۔ پلیز۔۔۔ مجھے افروز۔۔۔"

"میں تمہیں کبھی افروز کو یاد کرنے سے منع نہیں کروں گا تمکین!۔۔۔ میں جانتا ہوں افروز نے اپنی چند ماہ کی رفاقت میں بہت محبت دی ہے تمہیں۔ وہ ایک بہترین انسان تھا۔ وہ اگر زندہ رہتا تو مجھے

تمہاری خوش قسمتی پر رشک آتا۔ لیکن تمکین! تم مانو یا نہ مانو، تمہیں تحفظ کی، سائبان کی ضرورت ہے۔ ہر عورت کو ضرورت ہوتی ہے۔۔۔آپی ہوتیں، کوئی تو ہوتا نا۔۔۔"

"لیکن میں آپ سے انصاف نہیں کر سکوں گی۔"

"میں تم سے گلہ نہیں کروں گا۔"

"میں شاید آپ سے محبت نہ کر سکوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں کبھی تم سے بدلے میں محبت نہیں مانگوں گا۔ مجھے یقین ہے، ایک روز تمہیں خود ہی مجھ سے محبت ہو جائے گی۔"

تمکین نے اب کی بار اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ کچھ دیر اُس کی طرف دیکھتا رہا، پھر کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم اچھی طرح سوچ لو، پھر میری بات کا جواب دینا۔ اور اب چلیں۔"

تمکین اٹھ کھڑی ہوئی۔

گھر سے بیگ لے کر وہ افروز کی قبر پر آئی تھی۔

کیا وہ کبھی افروز کو بھول سکتی ہے؟۔۔۔ نہیں، کبھی نہیں۔

فاتحہ کے بعد وہ کتنی ہی دیر تک قبر کے پاس بیٹھی رہی۔

دانیال مرزا پچھلے دو ماہ سے اشاروں کنایوں میں کوئی نہ کوئی بات کہتا رہتا تھا، جسے وہ سمجھ کر بھی نظر انداز کر دیتی تھی۔ بوا، عقیل، انکل شکیل، خدیجہ۔۔۔سب کی یہی مرضی تھی کہ وہ دانیال سے شادی کر لے۔
دانیال وہ شخص تھا جسے ابی جان نے اس کے لئے چنا تھا۔ لیکن اسے افروز کی زندگی میں شامل ہونا تھا، اس لئے سعادت بیگ اپنا وعدہ نہ نبھا سکے تھے۔ دانیال مرزا اچھا شخص تھا۔ اس نے اس سے چڑنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ گھر آتا یا

عقیل کے گھر اس کی ملاقات تمکین سے ہوتی، وہ دوستوں کی طرح ہی اس سے بات کرتی تھی۔ لیکن اس نے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کبھی دانیال سے شادی کرلے گی۔

'نہیں، میں اپنی زندگی تنہا گزار سکتی ہوں، افروز کی یادوں کے ساتھ۔'

اُس نے وہاں ہی قبر کے پاس بیٹھے بیٹھے سوچا۔

''میرا خیال ہے، اب چلیں۔ دیر ہوگئی تو بوا پریشان ہو جائیں گی۔ اور پھر مناسب بھی نہیں ہے دیر سے جانا۔''

دانیال نے کہا تو وہ پلکوں پر اٹکے ہوئے آنسو ہاتھوں کی پشت سے پونچھتے ہوئے کھڑی ہوگئی اور دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے نیچے اُترنے لگے۔

VVV

''ارے تمکین! تم جا رہی ہو؟۔۔۔ میں ابھی چائے بنوانے جا رہی تھی۔''

خدیجہ نے تمکین کو چادر لیتے دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں۔۔۔ بہت تھکاوٹ ہوگئی ہے۔ کچھ دیر ریسٹ کروں گی۔ رات کو آئوں گی پھر۔''

''ٹھیک ہے، آرام کرلو جا کر۔ تم اپنی صحت کا بھی تو خیال نہیں رکھتی ہو۔ بوا نے تمہاری بہت شکایتیں کی ہیں۔ عقیل کی شادی کی مصروفیات میں تم سے بات نہیں کر سکی۔ اب فارغ ہوئی ہوں تو تمہاری خبر لیتی ہوں۔''

تمکین کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''بوا تو چاہتی ہیں کہ میں کھا کھا کے پہلوان بن جائوں۔''

''خیر، اب تو تم جائو، بعد میں بات ہوگی۔'' خدیجہ بھی مسکرا دی تھی۔

عقیل کی شادی گو سادگی سے ہوئی تھی، پھر بھی بے حد تھکاوٹ ہوگئی تھی۔ رات بھی وہ سب جاگتے رہے تھے۔ بارات بالا کوٹ جانا تھی۔ سو واپس آتے آتے خاصی دیر ہوگئی تھی۔ صبح کے قریب کہیں جا کر آنکھ لگی تھی، لیکن ولیمہ چونکہ دن کا تھا، اس لئے انکل شکیل نے سب کو ہی جگا دیا تھا۔ اور پھر فارغ ہو کر گھر آتے آتے پانچ بج گئے تھے۔ تمکین کچھ دیر تو بیٹھی تھی لیکن پھر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

'دو تین گھنٹے کی نیند لے لوں تو رات تک فریش ہو جائوں گی۔'

یہی سوچتے ہوئے چادر ٹھیک طرح سے اپنے گرد لپیٹتے ہوئے وہ باہر نکلی تو اپنی جیپ کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے دانیال مرزا کو دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

''آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟''

''ہاں سے تمام بچاہوا کھانا لے کر ابھی آیا ہوں۔ کھانا اندر بھجوا کر سوچ رہا تھا کہ۔۔۔۔''

''آپ بھی کچھ دیر آرام کر لیں اپنے ہوٹل جا کر۔ یہاں تو بہت ہنگامہ ہے۔ ابھی میں بھی کچھ دیر سونے کے لئے گھر جا رہی ہوں۔'' اس نے خلوص سے مشورہ دیا۔

''تمکین!'' دانیال نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ ''میں صبح واپس جا رہا ہوں۔ دو تین دن کراچی رہ کر امریکہ چلا جاؤں گا۔ ہفتہ بھر پہلے ہی چلا جاتا، لیکن عقیل کی شادی کی وجہ سے رک گیا تھا۔۔۔۔ تمکین! میری وجہ سے اگر آپ کو کوئی تکلیف۔۔۔۔''

''کیسی بات کرتے ہیں آپ۔۔۔۔؟'' تمکین نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''آپ کی وجہ سے تو میں کئی بار موت کے منہ میں جانے سے بچی۔ اور آپ تو میرے ایسے دوست ہیں، جن سے میں نے ہر بات شیئر کی ہے۔''

''یہ دوستی، دائمی دوستی میں بھی بدل سکتی تھی تمکین! اگر آپ چاہتیں تو۔''

''اتنی جلدی یہ سب ناممکن ہے۔۔۔۔ بہت مشکل۔''

''تو۔۔۔۔؟'' دانیال کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ ''میں انتظار کر سکتا ہوں، تمکین! ایک سال، دو سال۔ تم ۔۔۔۔ کوئی آس کا دیا تو میرے ہاتھ میں تھماؤ۔''

''ابھی سے میں کچھ کیسے کہہ سکتی ہوں دانیال؟'' تمکین نے پہلی بار اس کا نام لیا۔ ''ہو سکتا ہے دو سال بعد بھی میں اپنے آپ کو افروز کی یادوں سے آزاد نہ کر سکوں۔ بے شک ہمارا ساتھ مختصر تھا، لیکن۔۔۔۔'' اس نے بے بسی سے دانیال مرزا کی طرف دیکھا۔ ''آپ اپنی زندگی کے دو سال رائیگاں کر دیں اور۔۔۔۔''

''نہیں رائیگاں ہوں گے میری زندگی کے دو سال۔ یار! جو وقت کسی انتظار میں گزرے، کسی خوب صورت انجام کے انتظار میں، وہ کہاں رائیگاں جاتا ہے؟'' وہ مسکرایا۔ ''تو میں آج سے ٹھیک دو سال بعد آؤں گا۔ ٹھیک ہے نا۔۔۔۔؟ میں تم سے رابطہ نہیں کروں گا۔ لیکن تم سے غافل بھی نہیں رہوں گا۔''

اس نے بے حد اشتیاق سے اس کے تھکے تھکے چہرے پر نظر ڈالی۔

اتنی تھکن اور اُداسی میں یہ حُسن سوگوار قیامت ڈھا رہا تھا۔

'جب یہ مسکرائے گی، خوش ہو گی تو میرے دل پر سے تو ایک ساتھ کئی قیامتیں گزر جائیں گی۔'

وہ دل میں سوچی گئی اپنی بات پر خود ہی کھل کر مسکرایا اور بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

''تمکین! تم بے حد خوب صورت ہو۔''

تمکین کے رخساروں پر ہلکی سی سرخی پھیل گئی اور اس نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ ''اب میں چلتی ہوں۔''

''تمکین۔۔۔۔!'' اُسے مڑتے دیکھ کر بے اختیار دانیال نے پکارا۔

''میں تمام دن کا تھکا ہوا، تُو تمام شب کا جگا ہوا

ذرا ٹھہر جا اسی موڑ پر، تیرے ساتھ شام گزار لوں''

تمکین ٹھٹک کر رک گئی۔ یک دم افروز نے جیسے اس کے کانوں میں سرگوشی کی تھی۔

''ذرا ٹھہر جا اسی موڑ پر۔۔۔'' دانیال ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

''میں صبح بہت سویرے نکل جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے، رات بھی ملاقات نہ ہو سکے۔ کیا جانے سے پہلے ہم کچھ وقت اکٹھے نہیں گزار سکتے؟''

اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ بے حد تھکے ہونے کے باوجود تمکین خاموشی سے اس کے ساتھ پلٹ پڑی۔

پھر شہر سے دُور ایک پُر فضا مقام پر وہ اندھیرا پھیلنے تک بیٹھے رہے۔ اس شام دانیال نے اسے اپنے متعلق، اپنے باباجان کے متعلق بہت کچھ بتایا۔ اپنے خواب، اپنی سوچیں، اپنی اپنے بچپن کی یادیں اس سے شیئر کیں۔

''پتہ ہے، تمکین! میرے باباجان مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ ہم دونوں جیسے ایک دوسرے کے دل میں رہتے تھے۔ جب انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے میرا رشتہ طے کر دیا ہے تو مجھے ذرا بھی اعتراض نہیں ہوا اور جب آپی نے مجھے بتایا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے تو مجھے لگا، جیسے میری کوئی بہت قیمتی متاع کھو گئی ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ لڑکی، جسے باباجان نے میرے لئے منتخب کیا ہو گا، وہ یقیناً یونیک ہو گی۔ اور شاید اس پوری دنیا میں کوئی اور لڑکی ایسی نہیں ہو گی۔ ہے نا عجیب بات؟'' وہ ہولے ہولے ہنستا تھا۔

''وہ لڑکی، جسے میں نے دیکھا تک نہ تھا، اس کے کھو جانے کا دکھ میں نے ہفتوں منایا تھا۔''

اسے خدا حافظ کہنے سے پہلے ایک بار پھر دانیال نے اسے باور کرایا تھا کہ وہ ٹھیک دو سال بعد پھر آئے گا۔

''دو سال بہت ہیں نا تمکین! ذہنی طور پر خود کو تیار کرنے کے لئے۔ لیکن اگر تم پھر بھی خود کو مائل نہ کر سکیں اس رشتے کے لئے تو میں مزید دو سال، چار سال، آٹھ سال انتظار کر سکتا ہوں۔''

حسب معمول اس کی بات سنے بغیر وہ تیز تیز بولتا چلا گیا تھا۔

اور پھر تمکین کئی دن بے حد اُداس رہی۔ جیسے کوئی اچھا دوست اُس سے بچھڑ گیا ہو۔۔۔ پھر ہولے ہولے اُس نے خود کو مصروف کر لیا۔۔۔ جاب نے بہت حد تک اسے مصروف کر لیا تھا۔ اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔

VVV

''ماما! کیا آپ میرے لئے اُداس ہوتی تھیں اور مجھے یاد کرتی تھیں؟''

''ہاں میری جان! میں تمہیں بہت یاد کرتی تھی۔''

تمکین نے مسکرا کر تیمور کی طرف دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈھلوانی راستے سے نیچے اُترنے لگی۔

وہ افروز کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد اِدھر اُدھر کے ٹیلوں اور پہاڑیوں پر گھومنے کے بعد واپس گھر جا رہے تھے۔

تیمور کو افروز کی طرح یہ جگہ، اس کے ارد گرد کا منظر، سب بہت پسند تھا۔ پہاڑوں کے پیچھے سے سورج کو نکلتے اور ڈوبتے ہوئے دیکھنا اسے بھی بہت پسند تھا۔

''مام کہتی تھیں، تمہارے پاپا تمہارے لئے بہت اُداس ہوں گے اور انہیں تمہارا بہت انتظار ہوگا۔ لیکن انہوں نے کبھی آپ کا نہیں بتایا۔''

''انہیں میرے متعلق پتہ جو نہیں تھا، جانو!'' تمکین نے چلتے چلتے رک کر اس کا رخسار تھپتھپایا۔

''اور آپ کو پتہ تھا میرا؟''

''ہاں۔'' وہ مسکرائی۔ ''مجھے تمہارا بہت انتظار تھا، لیکن۔۔۔۔'' اس نے اپنی سسکی کو اپنے اندر ہی دبالیا۔

وہ تو اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس ظالم دنیا سے رُوٹھ کر چلا گیا تھا۔ لیکن پھر اللہ نے اس کی خالی جھولی کو بھر دیا۔ اللہ بھی کس کس طرح اپنے بندوں پر مہربان ہوتا ہے۔ انکل افضل، جو افروز کے باباجانی کے دوست تھے اور جو امریکہ میں افروز کے ساتھ تھے، انہوں نے اسے اپنے بچوں کی طرح ہی عزیز رکھا تھا۔ ایک دن اچانک تیمور کو ساتھ لئے ایبٹ آباد آ گئے تھے۔ انکل شکیل اسے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ وہ تیمور کو دیکھ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا، جیسے افروز کا بچپن لوٹ آیا ہو۔ وہ سارا کا سارا افروز کی طرح تھا۔ بالکل ویسی ہی ناک، ویسے ہی

ہونٹ، ویسی ہی آنکھیں۔۔۔۔ بس ذرا اس کی رنگت افروز کے مقابلے میں زیادہ فیئر تھی وہ اس وقت عقیل بھائی کی بیوی کے پاس ہی بیٹھی تھی اور تیمور کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ۔۔۔۔'' انکل شکیل نے اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ''افروز کا بیٹا ہے۔''

وہ بے اختیار تیمور کی طرف بڑھی تھی اور اس نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

''افروز نے اسے کتنا تلاشا تھا۔ لیکن میری جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔''

انکل افضل، انکل شکیل کو افروز کی شادی کے متعلق بتا رہے تھے۔ اور وہ تیمور کو دیوانوں کی طرح دیکھے جا رہی تھی۔

''تین ماہ قبل میری نے تیمور کو میرے اپارٹمنٹ میں چھوڑ دیا، ایک خط کے ساتھ جو اس نے افروز کو لکھا تھا۔ وہ افروز کی موت سے باخبر نہیں تھی۔''

تمکین نے وہ خط پڑھا تھا، اس نے لکھا تھا۔

''افروز! میں چاہتی تھی کہ اب کے جو بچہ ہو، میں اسے خود پالوں۔ حکومت مجھ سے وہ بچہ نہ لے جیسا کہ پہلے ویلفیئر والے لے جاتے تھے۔ میں جانتی تھی کہ اگر میں تمہارے ساتھ رہوں تو بچے کی خاطر تم ہمیشہ میرے ساتھ زندگی گزارو گے۔ لیکن میں خود کو تمہارے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ میں تمہیں تمہاری نیکی اور اچھائی کی سزا نہیں دینا چاہتی تھی۔ مجھے بچہ مل گیا تھا۔ میرے بچے کا باپ موجود تھا، جو کہ ایک اعلیٰ پوسٹ پر تھا۔

ویلفیئر والے اسے مجھ سے نہیں چھین سکتے تھے۔ دو بار جب انہوں نے مجھے پکڑا تو میں نے انہیں بتایا کہ تم پاکستان گئے ہوئے ہو۔ اس کے برتھ سرٹیفکیٹ میں تمہارا نام باپ کی جگہ موجود ہے۔ نہ بھی ہوتا تو کوئی بھی اسے دیکھتے ہی کہہ سکتا ہے کہ یہ تمہارا بیٹا ہے۔ ایک بار تم نے کہا تھا کہ تمہیں تیمور نام بہت پسند ہے۔ اگر تم خود اپنا نام رکھتے تو یہ رکھتے۔ سو میں نے تمہارے بیٹے کا نام یہی رکھا ہے۔ میں اگر زندہ رہتی تو اسے ایک مسلمان کی طرح ہی پالتی اور اسے بتاتی کہ تم ایک بہت اچھے مسلمان کے بیٹے ہو۔۔۔ لیکن افسوس! چند دن پہلے مجھے پتہ چلا کہ میں ایڈز کی مریض بن چکی ہوں۔ میرا HIV پوزیٹو آیا ہے۔۔۔ اور اس سے پہلے کہ ویلفیئر والوں کو پتہ چلے اور وہ اسے چھین لیں، میں اسے تمہارے اپارٹمنٹ میں چھوڑے جا رہی ہوں۔ تیمور کو میں نے تمہارے متعلق بتا دیا ہے۔ تمہاری بیوی کو، اگر تم شادی کر چکے ہو تو یقیناً کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ تیمور بہت اچھا بچہ ہے۔ پھر مجھے یقین ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہوگی۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی تمہارے قریب رہے اور تم سے محبت نہ کرے۔ تم اتنے ہی اچھے ہو افروز!۔۔۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں بہت عرصہ زندہ نہیں رہوں گی۔ لیکن میں بہت خوش ہوں کہ تیمور اپنے خاندان، اپنے باپ کے گھر میں پلے گا۔"

"میں نے میری کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی تھی، لیکن وہ مجھے نہیں ملی۔ میں اسے افروز کی ڈیتھ کا بتانا چاہتا تھا۔" انکل افروز نے بتایا تھا۔ "اور جب مجھے پتہ چلا تو اسے دنیا سے رخصت ہوئے تین دن ہو چکے تھے۔ اس نے بہت زیادہ مقدار میں نیند کی گولیاں کھا کر اپنی زندگی ختم کر لی تھی۔ تب میں نے یہی فیصلہ کیا کہ تیمور کو اس کے خاندان میں پہنچا دوں۔"

تمکین نے اسے گلے لگا لیا۔ وہ خوش تھی کہ افروز کا کوئی نام لیوا ہے اس دنیا میں۔ اُس کی پراپرٹی کا جائز وارث۔ اور تبھی وہ تیمور اور بوا کے ساتھ پھلکوٹ آگئی تھی۔

افروز کے گھر میں، اُس کے بیٹے کے ساتھ رہتے ہوئے اسے سال ہو گیا تھا۔ اس دوران اپنی پراپرٹی کے سلسلے میں اسے اپنے وکیل اور عقیل بھائی کے ساتھ لاہور بھی جانا پڑا تھا۔ وہ تیمور کو بھی ساتھ لے گئی تھی۔ اور جب وہ ماڈل ٹاؤن آئی تو شہر بانو اور مہر بانو اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ افروز۔۔۔" مہر بانو کی نظریں تیمور پر تھیں۔

"آپا نے تو اسے مار کر افروز کی نسل ختم کر دی تھی، لیکن یہ پھر زندہ ہو کر میرے پاس آگیا۔"

"جھوٹ مت بولو۔" شہر بانو چیخی تھیں۔ "وہ بھلا اتنا بڑا کیسے ہو سکتا ہے؟ اور ہوتا تو۔۔۔ دو، ڈھائی سال کا ہوتا اس وقت۔ اور یہ تو سات آٹھ سال۔۔۔"

"ہاں، وہ ہوتا تو۔۔۔" تمکین کے لبوں سے آہ نکلی تھی۔ "وہ نہیں ہے، لیکن یہ ہے اماں! افروز کی پہلی بیوی سے۔۔۔ اس کا انتقال ہو گیا ہے اور یہ میرے پاس آگیا ہے۔ اماں! اس کے لئے دعا کریں۔" اس نے شہر بانو کی طرف سے پیٹھ موڑ لی تھی۔

مہر بانو نے بے اختیار تیمور کو گلے لگا کر اس کی پیشانی چومی تھی۔

"اللہ اسے جیتا رکھے۔ مجھے اپنے دادا کی نسل ختم ہو جانے کا بہت دکھ تھا۔" مہر بانو اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"تیمور! یہ تمہارے پاپا کا گھر ہے اور اس گھر میں تمہارا حصہ بھی ہے۔"

شہر بانو نے ایک غصیلی نظر اس پر ڈالی تھی اور وہاں سے چلی گئی تھیں

'کیا آپا کو اپنے کئے کا کوئی پچھتاوا، کوئی افسوس نہیں ہے؟' اُس نے حیرت سے سوچا تھا۔ 'اور کیا ان کو ان کے کئے کی کوئی سزا نہیں ملے گی؟۔۔۔ شاید اگر یہاں نہیں تو وہاں۔'

پھر وہ زیادہ دیر وہاں نہیں رکی تھی۔

مہر بانو نے پہلے کی طرح ہی اس سے معافی مانگی تھی اور اس سے پہلے اپنے لئے دعا کرنے کو کہا تھا۔ وہ تمکین کو پہلے کی طرح ہی بے چین، مضطرب اور بے بس نظر آئی تھیں۔ لیکن شہر بانو۔۔۔ شاید کچھ لوگ ہوتے ہیں ان کے جیسے شقی القلب اور سخت دل۔

"گرینڈ مام! آپ ہمارے ساتھ چلیں نا۔" تیمور نے اصرار کیا تھا۔ وہ بالکل افروز جیسا تھا۔ ہر ایک سے محبت کرنے والا۔

"ہاں اماں! چلیں نا۔" تمکین نے تیمور کی خوشی کے لئے اصرار کیا تو وہ بس بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

VVV

"ہے۔۔۔ ہے۔۔۔ سنو!"

وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ دانیال اونچے نیچے پتھروں کو پھلانگتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔

"آپ۔۔۔؟" تمکین کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"ہاں، میں۔" وہ اُس کے بالکل سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ان دو سالوں میں وہ ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔ "دانیال مرزا۔۔۔ مرزا سعادت بیگ کا اکلوتا شہزادہ۔۔۔" اُس نے تھوڑا سا سر کو خم کیا۔ "ٹھیک دو سال بعد آپ کے سامنے۔"

تمکین، تیمور کا ہاتھ تھامے ساکت کھڑی تھی۔

"ہے۔۔۔" اس نے اُس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ "کیا سکتہ ہو گیا ہے؟"

"ہاں۔۔۔ نہیں تو۔" وہ چونکی۔ "آپ کیسے ہیں؟۔۔۔ کب آئے؟"

"میں اللہ کے فضل و کرم سے بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اور کب آیا، تو پاکستان آئے دو مہینے ہو گئے ہیں۔ البتہ پھلکوٹ۔۔۔" اس نے بغیر سانس لئے تیز تیز بولتے ہوئے تیمور کے رخسار کو تھپکا۔

"ہیرو! تم کیوں خاموش کھڑے ہو؟"

"میں آپ کو سن رہا تھا اور دیکھ رہا تھا۔"

"یہ تیمور ہے۔" تمکین نے بتایا۔

"مجھے معلوم ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اگرچہ میں تم سے رابطہ نہیں رکھوں گا، لیکن تم سے بے خبر نہیں رہوں گا۔"

"عقیل بھائی۔۔۔" تمکین کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"ہاں تو پھر کیا خیال ہے تمہارا؟" وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ "کیا اب تم ذہنی طور پر تیار ہو مجھے قبول کرنے کے لئے؟"

اور تمکین، جس نے متعدد بار سوچا تھا کہ اگر دانیال آیا تو اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لے گی، تیمور کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

'کیا تیمور کے ہوتے ہوئے بھی۔۔۔؟' اُس نے سوچا۔ تبھی تیمور اُس کا ہاتھ چھڑا کر بھاگ گیا۔

"تیمور! سنبھل کر بیٹا۔"

"ڈونٹ وری مام!" وہ دور کھڑا ہنس رہا تھا۔

"تم تیمور کے لئے پریشان مت ہو۔ وہ مجھے بھی اتنا ہی عزیز ہو گا، جتنا تمہیں ہے اور تیمور کو بھی ضرورت ہے میری۔"

"لیکن وہ۔۔۔" تمکین ہچکچائی۔ آج وہ اپنی بات پوری نہیں کر رہی تھی۔

"وہ میرا مسئلہ ہے۔ دیکھنا، وہ میرا سب سے بڑا حمایتی ہو گا اور تمہیں تو پھر وہ لفٹ ہی نہیں کرائے گا میرے ہوتے ہوئے۔"

"جی نہیں، بیٹے ماؤں سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔" بے اختیار ہی وہ بولی تھی۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ میرا انتظار رائیگاں نہیں گیا۔" دانیال کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

"لیکن وہ ساری پراپرٹی، پیسہ، جو افروز کا ہے، وہ میں ابھی سے تیمور کے نام کر دوں گی۔"

اور اس نے بے اختیار قہقہہ لگایا تھا۔

"اگر یہ بات تم نہ کہتیں تو میں کہہ دیتا۔ تھینکس تمکین! ویسے مجھے بوا کے سامنے دامن پھیلانا چاہئے یا انکل شکیل سے درخواست کرنی چاہئے؟"

تمکین نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ تیمور کو دیکھنے لگی تھی، جو نیچے ایک پتھر پر بیٹھا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دانیال نے اس کی طرف دیکھ کر وکٹری کا نشان بنایا تو وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور چلایا۔

"پاپا! کانگریچولیشن۔۔۔!"

تمکین نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ۔۔۔۔یہ تیمور کیا کہہ رہا تھا؟"

"یار! کچھ نہیں۔ مبارک باد دے رہا ہے۔" دانیال نے معصومیت سے کہا۔ "بڑی گہری دوستی ہے ہماری۔"

"لیکن یہ دوستی کب اور کیسے ہوئی؟" تمکین اُلجھی سی اُسے دیکھ رہی تھی۔

"اسی ایک ماہ میں، جب سے پھلکوٹ میں ہوں۔"

"آپ ایک ماہ سے یہاں ہیں اور مجھ سے ملنے آج آئے ہیں۔"

"تو تم سے تو پورے دو سال بعد ملنے کا وعدہ تھا نا۔۔۔؟" دانیال اسی معصومیت سے کہہ رہا تھا۔ "اور آج ٹھیک دو سال بعد۔"

اور تمکین کو ہنسی آگئی۔

"آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ کیا بتایا آپ نے تیمور کو؟"

"یہی کہ تمہاری مام مجھ سے ناراض ہو گئی ہیں اور تم دعا کرو کہ وہ راضی ہو جائیں اور یہ کہ میں بھی اس سے اتنا ہی پیار کرتا ہوں جتنا اگر اس کے افروز بابا ہوتے تو کرتے۔"

تمکین کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔ وہ تیمور کے قریب پہنچ گئے تھے، جو آنکھوں میں چمک لئے سرخ چہرے کے ساتھ دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

'شاید کتابِ زندگی میں یہی لکھا گیا تھا۔ ایسا ہی ہونا تھا۔ اس طرح۔'

تمکین نے سوچا اور تیمور کا ہاتھ پکڑ کر بہت اطمینان اور سکون سے گھر کی طرف چلنے لگی۔ اور دانیال حسبِ معمول اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے تیز تیز بول رہا تھا۔

ختم شد